۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان و ادب

اور

پروفیسر نذیر احمد

مرتبہ

سید رضا حیدر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان وادب

اور

پروفیسر نذیر احمد

۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان و ادب
اور
پروفیسر نذیر احمد

مرتبہ

سید رضا حیدر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

1947 KE BAAD FARSI ZABAN-O-ADAB
AUR PROF. NAZIR AHMAD
Edited:
Syed Raza Haider

ISBN 81-8172-077-6

بہ اہتمام	:	ڈاکٹر ادریس احمد
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۶ء
قیمت	:	۲۰۰/روپے
مطبوعہ	:	اصیلا پرنٹنگ پریس، نئی دہلی

پیش لفظ

پروفیسر نذیر احمد اردو و فارسی کے نامور محقق، مستند عالم، وسیع النظر دانشور، باشعور ادیب، ماہرِ لغت اور ایک ممتاز ایران شناس کے طور پر علمی دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ہندو بیرون ہند کے جتنے بھی ادباء، علماء اور دانشور ہیں سبھی آپ کی دانشوری کے قایل ہیں اور آپ کا نام نہایت عزت واحترام سے لیتے ہیں۔

آپ ہمارے اُن بڑے ادیبوں اور دانشوروں میں سے تھے جنہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس میں نئے نئے گوشے اور معنی ومفاہیم تلاش کیے۔ بنیادی طور پر آپ فارسی کے استاد تھے مگر اردو کے بھی نامور محقق اور مستند عالم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد نے فارسی زبان کے وسیلے سے تاریخ وتہذیب کے متعدد ایسے موضوعات کو پیش کیا جو اہلِ علم کی نظروں سے اوجھل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اُن کی تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں فارسی زبان وادب کی تاریخ وتہذیب کو سمجھنے میں کافی آسانی ہوتی ہے۔ ان ہی اسباب کی بنیاد پر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ دورِ جدید میں تحقیق کے میدان میں اُن کا کوئی ثانی نہیں دکھائی دیتا۔ ایک اور بات جو انہیں اپنے معاصرین میں نمایاں کرتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے صرف تحقیق ہی کو اپنے

موضوع کا مرکز ومحور نہیں بنایا بلکہ متن کی تصحیح، مخطوطہ شناسی، فرہنگ نگاری، نقدِ مصوری اور خطاطی پر بھی قلم اٹھایا۔ خاص طور پر آپ نے سیکڑوں ایسے مخطوطوں کو علمی دنیا میں روشناس کرایا جو نایاب سمجھے جاتے تھے۔

پروفیسر نذیر احمد نے اردو فارسی زبان وادب کے تعلق سے اتنا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے کہ آنے والی کئی نسلیں اُس سے فیض یاب ہوتی رہیں گی۔ آپ کے تبحرِ علمی کو دیکھتے ہوئے ہم انہیں فارسی زبان کی عزت وآبرو کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ سے پروفیسر نذیر احمد کا اُس وقت سے تعلق تھا جب اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ آپ غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیرمین، وائس چیرمین اور سکریٹری رہے اور آپ کی نگرانی میں اس ادارے کو بین الاقوامی شہرت ملی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کو ایران، افغانستان، سنٹرل ایشیا اور فارسی دنیا میں متعارف کرانے میں پروفیسر نذیر احمد کی کوششوں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے انعامات کو پوری ادبی دنیا میں ایک اعتبار حاصل ہے۔ ان انعامات میں ایک انعام فارسی کا بھی ہے جو ہر برس فارسی کے کسی بڑے عالم کو اُن کی خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے، اس انعام کی ابتدا بھی پروفیسر نذیر احمد نے ہی کی تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والی کئی اہم کتابیں بھی آپ سے منسوب ہیں یہ تمام کتابیں اتنی اہم ہیں کہ اس سے نہ صرف فارسی بلکہ اردو کے اساتذہ وطلبہ کو مدد مل رہی ہے۔

اِن ہی تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس ادارے نے ۸۔۷ مئی ۲۰۱۶ کو اُن کی یاد میں ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک وبیرونِ ملک کے کئی اہم اسکالرز نے شرکت کی۔ یہ سمینار ''۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد'' کے موضوع پر تھا جس میں تقریباً ۲۴ مقالات پیش کیے گئے۔

ہم سبھی کے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ ہم نے اِن تمام مقالات کو جمع کر کے آپ کے سامنے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں پروفیسر نذیر احمد کی زندگی اور اُن کی خدمات کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ اہل علم اس کتاب کے مطالعے کے بعد اپنی رائے سے بھی ہمیں آگاہ کریں گے۔

سید رضا حیدر

فہرست

شریف حسین قاسمی

پروفیسر نذیر احمد

شخصیت و کارنامے

دردی بہ دل رسید کہ آرام جان برفت
وان ہر کہ در جہان بدریغ از جہان برفت
شاید کہ چشم چشمہ بگرید بہ ہای ہای
بر بوستان کہ سر و بلند از میان برفت

پروفیسر نذیر احمد غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے وقت ہی سے آپ اس سے وابستہ رہے۔ آپ غالب انسٹی ٹیوٹ کے بورڈ آف ٹرسٹیز اور مجلس عاملہ کے ایک فعال رکن رہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی مختلف ذیلی کمیٹیوں کے ممبر کی حیثیت سے آپ نے قابل قدر کام انجام دیے۔ تادم واپسیں سمینار کمیٹی کے صدر رہے۔ اردو اور فارسی زبان و ادب سے متعلق متعدد اہم ملی اور بین الملی سمینار منعقد کرانے میں آپ نے بنیادی خدمات انجام دیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سے آپ کی گہری، پر خلوص اور علمی و ادبی وابستگی کے پیش نظر آپ کو اس موقر ادارے کا سکریٹری منتخب کیا گیا اور پھر بعد میں آپ اس کے صدر بنائے گئے۔ یہ اہم ذمہ داری آپ نے آخری دم تک نبھائی۔

''غالب نامہ'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے آپ نے اس علمی اور تحقیقی رسالے کی جو خدمات انجام دی ہیں، اس کا اعتراف علمی وادبی حلقوں میں بار ہا کیا گیا ہے۔ ''غالب نامہ'' کے لیے معیاری مقالات حاصل کرنے کے لیے اہل علم کو خطوط لکھنا، مقالات کا انتخاب کرنا، طباعت سے پہلے مقالات پر نظر ڈالنا اور پھر مجلّے کی اشاعت تک نگرانی کرنا، یہ کام پروفیسر نذیر احمد صاحب مرحوم نہایت دلچسپی اور علمی دیانت کے ساتھ برابر انجام دیتے رہے۔ آپ کی ان بے لاگ کوششوں کی وجہ سے ''غالب نامہ'' کا آج موقر، ممتاز اور اعلیٰ علمی معیار کے رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ خود پروفیسر نذیر صاحب کے مختلف علمی وادبی مقالات خاص طور پر غالب کے ادبی اور علمی کارناموں پر آپ کی نگارشات نے بھی اس رسالے کے علمی وادبی وقار کو برقرار رکھنے میں مدد کی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب بنیادی طور پر فارسی زبان و ادب کے استاد و محقق تھے۔ دنیائے فارسی میں جہاں تک تحقیق و تدوینِ متن کا تعلق ہے، آپ کا نام سب سے معروف و معتبر ہے۔ ادبی و علمی تحقیق کا معاملہ ہو یا تدوین متن کا مسئلہ، ان دونوں امور میں خاص طور پر پروفیسر نذیر احمد کے دکھائے ہوئے راستے اور بتائے ہوئے طریقوں پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور ان کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کی کتابوں کو اہل علم اور خاص طور پر مشرقی علوم کے محقق اپنا چراغ راہ اور رفیق طریق سمجھتے ہیں۔ تحقیق و تدوین کے میدان میں پروفیسر نذیر صاحب نے جس قدر معیاری کام انجام دیے ہیں، اس کی توقع ایک علمی اکیڈمی ہی سے کی جا سکتی ہے جہاں چند صاحب نظر علما مل کر قابلِ قدر کام انجام دیتے ہیں۔ اسی پرکاری اور علمی و تحقیقی کاموں میں اعلیٰ معیار کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے آپ کا بجا طور پر جہاں فارسی کے مفاخر میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ ہندستان میں ان کے وابستگان کے لیے بھی باعث فخر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے تحقیقی اور علمی کاموں کی قدر و منزلت کا صرف وہی صاحبان نظر اندازہ لگا سکتے ہیں جو خود ان ہی کی طرح صاحب علم و فضل ہوں۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کے کاموں کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا اور جو بھی یہ کام انجام دے گا، اسے یہ احساس ہوگا کہ ایک محقق، مورخ اور عالم کے کارناموں کی کامیابی کا پیمانہ اور اس بات کی شہادت کہ اس کو اپنے فن میں کس درجے کا ملکہ اور مہارت حاصل ہے، اسے کس

نوعیت کی علمی بصیرت ودیعت کی گئی ہے، اس کوچے کی رسم وراہ سے وہ کہاں تک آگاہ ہے، یہ نہیں کہ اس نے کتنے صفحے سیاہ کیے اور کتنی ضخیم کتابیں پیش کی ہیں، اس کا راز دراصل اس کے جزئیات، معلومات کے انتخاب اور اس کے ردوقبول میں پوشیدہ ہے جس سے اس نے اپنی تصانیف میں کام لیا ہے۔

پروفیسر نذیر صاحب کی داستان زندگی بڑی سبق آموز ہے۔ مشیت الٰہی کس طرح ایک خاص خدمت کے لیے کسی کا انتخاب کرتی ہے اور اسی کے مطابق وسائل فراہم ہوتے جاتے ہیں، اسی کی روداد ہے نذیر صاحب مرحوم کی زندگی بھی۔

آپ ۳ر جنوری ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش کے ضلع گونڈہ، پوسٹ آفس پنگواں کے ایک غیر معروف گاؤں ''کوھی غریب'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی محمد اسماعیل تھا۔ اس گاؤں میں تعلیم کا کوئی خاص معیاری انتظام نہیں تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے گاؤں کی عیدگاہ کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر پنگواں کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ ذہانت رنگ لائی اور آپ مختلف امتحانات میں نمایاں کامیابیوں کی وجہ سے وظیفے کے حقدار قرار دیے جاتے رہے۔ بالآخر تعلیم مکمل کرنے کے لیے لکھنؤ آئے۔ تعلیم کے اعلا علمی مراحل آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں طے کیے جہاں فارسی کے نامور استاد و محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی نگرانی میں نذیر صاحب نے ''احوال وآثار ظہوری'' پر ۱۹۴۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ''عادل شاہی دور کے فارسی شعرا'' پر اسی یونیورسٹی سے ۱۹۵۰ء میں آپ کو ڈی لٹ عطا کی گئی۔ اس کے علاوہ اردو میں بھی آپ نے موسیقی پر ابراہیم عادل شاہ کی نہایت اہم کتاب 'نورس' کو تحقیق وتنقیدی انداز سے مرتب کیا جس پر لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈی لٹ کی ایک دوسری ڈگری عطا کی گئی۔ جس کو علم کا سبق یاد ہو جائے، اسے پھر چھٹی نہیں ملتی۔ یہی علم کی لگن آپ کو ۱۹۵۶ء میں ایران لے گئی جہاں سے آپ نے فارسی قدیم، پہلوی اور جدید فارسی میں ڈپلوما حاصل کیا۔ ایران میں اپنے قیام کے دوران بھی آپ تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ مختلف کتب خانوں میں محفوظ خطی نسخوں کا مطالعہ کیا، ان پر تحقیقی مقالات لکھے اور شائع کرائے۔ استاد ذبیح اللہ صفا (مؤلف تاریخ ادبیات فارسی در ایران)، بدیع الزماں فروزانفر (ماہر مثنوی معنوی)، استاد کیا، استاد معین، استاد پرویز ناتل خانلری آپ کے ایرانی

اساتذہ میں بڑی علمی و تحقیقی شہرت کے مالک ہیں۔

آپ کے مختلف النوع علمی کارناموں کی روشنی میں تحقیق، تنقید، تدوین متن، نسخہ شناسی، کتبوں کی ادبی و تہذیبی اہمیت، علمی انداز پر سوانح نگاری، قرون وسطیٰ کے ہندستان کی تاریخ، فن نقاشی، موسیقی، نجوم، کتبہ شناسی، زبان شناسی، فن تعمیر، طب، تاریخ اور اس کے مسائل کی تنقیح و تجزیہ، استخراج وغیرہ کے قابل قبول اصول مرتب کیے جا سکتے ہیں اور کیے بھی گئے ہیں۔
اسی طرح فرہنگوں پر نقد و تبصرہ اور ان کی تصحیح و ترتیب ایک علمی اور فنی کام ہے۔ نذیر صاحب کو اس میدان میں خاص ملکہ، استعداد و صلاحیت ودیعت کی گئی تھی۔ اس کام کے لیے گہری علمی بصیرت اور بھر وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ دور بہ دور فارسی فرہنگ نویسی کی تاریخ سے واقفیت، عربی حتیٰ سنسکرت اور ہندی زبانوں سے آشنائی، مختلف زبانوں میں الفاظ کے معانی و مفاہیم اور تراکیب کی سرگذشت پر نظر، خود فارسی زبان کے دستور و قواعد سے ذہنی مناسبت وغیرہ ایسے امور ہیں جو فرہنگوں پر کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہیں۔ ہندستان میں فارسی کی متعدد معتبر اور متداول فرہنگیں تالیف کی گئی ہیں، لیکن پروفیسر نذیر احمد صاحب سے پہلے کسی نے فارسی کی قدیم فرہنگوں کو اعلیٰ علمی و فنی معیار پر پرکھا اور مرتب کیا ہو، اس کا راقم کو تو علم نہیں۔ اس اعتبار سے نذیر صاحب کو اس میدان میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ فرہنگ نویسی سے دلچسپی کے باعث مرحوم نے غالب کی قاطع برہان پر گہری علمی و تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ نذیر صاحب نے غالب کی ہمہ جہت ادبی عظمت کا اعتراف کیا ہے، لیکن فرہنگ نویسی میں جو تسامحات ان سے سرزد ہوئے ان کی عالمانہ وضاحت بھی کی ہے۔ اس کتاب کے اصل موضوع پر سیر حاصل تبصرے کے علاوہ نذیر صاحب نے قاطع برہان کے مطالعے کے ضمن میں دساتیر پر ایک نظر، غالب اور صاحب برہان قاطع میں اتحاد نظر، غالب اور ذال فارسی، تخیصات اور لغات فارسی کے عنوانات کے تحت جو بحث کی ہے وہ اردو زبان میں خاص طور پر اپنی نوعیت کی پہلی علمی کاوش ہے۔ اس کام میں آپ نے کمال تحقیق و جستجو سے ان موضوعات کے تمام بنیادی اور اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور اس طرح دساتیر کے سلسلے میں، غالب جس کا شکار ہوئے تھے، جعل کا پردہ فاش کیا ہے۔

نذیر صاحب کے علمی و ادبی کارناموں کے بارے میں ان کی ایک دوسری اہم

کامیابی کا ذکر ضروری ہے۔ وہ ہے امیر خسرو دہلوی کی نہایت مشکل، فنی اور ادبی کتاب 'اعجاز خسروی کا انگریزی ترجمہ۔ خسرو کی یہ کتاب غالباً فارسی میں لکھی جانے والی نہایت مشکل کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ نذیر صاحب نے اس کے ترجمے کے لیے مترجمین کی ایک ٹیم بنائی اور اعجاز خسروی کے پانچ رسائل کو اس ٹیم نے آپ کی سرپرستی اور راہنمائی میں انگریزی میں منتقل کیا۔ ایک رسالے کا ترجمہ خود اس خاکسار کے ذمے بھی تھا۔ یہ کتاب اب چھپ چکی ہے۔ نذیر صاحب کی فعال اور علمی راہنمایی کے بغیر یہ معرکۃ الآرا کام پایۂ تکمیل کو مشکل ہی سے پہنچتا۔ اس ترجمے پر نذیر صاحب کے حواشی آپ کی علمی بصیرت کے شاہد ہیں۔

انگریزی، اردو اور فارسی میں نذیر صاحب کے سینکڑوں مضامین و مقالات اور کتابیں، ان گنت قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت و صدر نشینی اور اعلیٰ علمی و انتظامی عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود جو وصف نذیر صاحب کی شخصیت میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور جس کی آب و تاب آج تک ماند نہیں پڑی، وہ ان کی سادگیِ مزاج اور تواضع و انکساری ہے۔ نرم خوئی، خوش گفتاری اور پاک نگاہی ان میں اس طرح رچی بسی تھیں کہ انہیں ان کی ذات سے الگ کرنا مشکل ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کی علم دوستی، مشرقی علوم خاص طور پر فارسی زبان و ادب کی گرانقدر خدمات کے پیش نظر ۱۹۷۷ء میں صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے آپ کو سرٹیفکٹ آف آنر سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے، جس کے علمی و ادبی کاموں کے آپ روح رواں رہے ہیں، تحقیق و تنقید کا انعام پیش کیا۔ ۱۹۷۸ء ہی میں حکومت ہند نے آپ کو پدم شری کا خطاب دیا اور اسی سال انٹرنیشنل امیر خسرو اکیڈمی، امریکہ نے آپ کی خدمت میں ''خسرو انعام'' پیش کیا۔ حافظ شیرازی پر وقیع کارناموں کے صلے میں حکومت ایران نے آپ کو ''حافظ شناس'' کا خطاب دیا۔ ۱۹۹۳ء میں اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمات کے لیے آپ کو ''اعزاز میر'' پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایران میں آپ کو ''جایزۂ افشار'' سے نوازا گیا اور

مزید برآں تہران یونیورسٹی نے آپ کو اعزازی ڈگری بھی عطا کی۔ یہ اعزاز جہاں تک مجھے علم ہے، کسی بھی دوسرے ہندستانی عالم کو میسر نہیں آئے۔

آذرمی دُخت صفوی

'۱۹۴۷ء کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد'

زیر بحث موضوع کے دو اہم پہلو ہیں اور دونوں پروفیسر نذیر احمد صاحب کی ذات گرامی سے مرتبط ہیں۔ یعنی ہندوستان میں آزادی کے بعد فارسی زبان وادب کی کیا حیثیت اور مقام رہا اور اس دوران استاد دانشمند وفقید جناب نذیر احمد صاحب نے اس کی کیا خدمات انجام دیں۔ موضوع کی اہمیت اور ہمہ گیری کا تقاضا ہے کہ اس پر اظہار خیال کئی شقوں کے تحت کیا جائے ۔صرف اسی صورت میں ہم اس سے منصفانہ طور پر عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ اس جید عالم اور محقق نے کیوں فارسی زبان وادب کو اپنے نقد و تحقیق کے لیے منتخب کیا؟ ان کی خدمات کیوں اس ملک کی تاریخ وفرہنگ کے لیے اس درجہ اہمیت رکھتی ہیں؟ آزادی کے بعد کی صورت حال اور بدلتے ہوئے اوضاع اس زبان پر کس طرح اثر انداز ہوئے؟ اور نئے عصری اور فرہنگی رجحانات کے اس دور میں پروفیسر نذیر صاحب کی تحقیق وتنقید نے کس طرح نہ صرف اس کی شمع کو روشن رکھا بلکہ اپنے انداز تحقیق، جدید زاویہ ہای نگاہ اور نئی دریافتوں سے فارسی زبان وادب کو ثقافت و تاریخ ہند کا ایک اہم حصہ بنا کر اس ملک میں اس کے مقام و دوام کے ضامن ہوئے۔ ان گونا گوں پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لیے ذیل میں چند معروضات حاضر خدمت ہیں جن میں ہندوستان اور فارسی کے قدیم وجدید رشتوں کے پس منظر میں جناب نذیر احمد صاحب کی بیش بہا خدمات کا جائزہ لیا جا رہا

ہے۔اس پس منظر کے بغیر ہم موصوف کے کارناموں کی اہمیت کو بطور احسن سمجھ ہی نہیں سکتے۔

ہندوستان اور ایران کے درمیان لسانی و ادبی داد و ستد کی اس طولانی اور ہمہ جہت داستان کا پہلا خوبصورت باب عادل نوشیروان کے عاقل وزیر کی اس سوجھ بوجھ اور ناقدانہ پرکھ سے شروع ہوتا ہے جس کے انگیزہ کے تحت وہ ہندوستان سے ان قدیم داستانوں کے مجموعہ کو بہترین رہ آورد جان کر اور اپنی حرز جان بنا کر ایران لے گیا جو شاید استعاراتی اظہار خیال کا اولین ،معنی خیز اور فکر انگیز نمونہ تھا اور جواب دنیا کے ادب میں ایک Icon کی حیثیت رکھتا ہے۔فرہنگان ہند کی زبان سنسکرت نے ایران کی قدیم زبانوں کے ساتھ مل کر جس فرہنگی رشتہ اور ادبی سلسلے کی بنیانگزاری کی تھی اس نے گزرتے ہوئے سالوں اور بدلتے ہوئے ادوار کے ساتھ ایسی وسعت، گیرائی اور ہمہ ہمی اختیار کی اور 'ہند ہزار دستار و ہزار گفتار' کے رنگارنگ کلچر کی حسین قوس وقزح میں ایسے شوخ اور لازوال رنگ کا اضافہ کیا کہ آج ۲۱ ویں صدی میں بھی اس کے بغیر ہندوستان کا Cultural Kaleidoscope نامکمل بلکہ ادھورا ہے۔

ہندو ایران کے یہ روابط گونا گون اور قدیم ہیں۔Pre-Diluvian زمانے اور ایلام کلچر سے ناشی یہ رشتے تاریخی، نژادی، لسانی، فرہنگی، اداری، ادبی اور فکری جہات رکھتے ہیں۔عہد ساسانی میں ایرانی اثر ونفوذ ہندوستان میں مالوہ تک، جو بعد میں ہندوستانی شہنشاہ چندر گپت موریہ کی سلطنت کا مرکز قدرت بنا، پہنچ گئے تھے۔خود موریہ سلاطین کے دربار اور ان کے رہائشی قصر ایرانی شاہی دربار اور ایرانی چوبی محلوں سے اثر پذیر تھے۔دوسری طرف ہندوستان کے کلچر کی نمایندگی آسیای مرکزی میں بودھ مذہب اور آرٹ کی گسترش کی طور پر ہوئی۔آر بری کے مطابق اس دور میں بودائی مذہب اور آرٹ میں زرتشتی مذہب اور ہنر ایران پر برتری رکھتا تھا۔اجنتا اور ایلورا کی گفاؤں میں موجود قدیم Frescos ہندو ایران باہمی روابط کی قدامت کے شاہد ہیں۔طلوع تاریخ اور ماخذ ومنابع تاریخی کی نمود کے بعد یہ روابط واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی زبان کی آمد کے بعد اس کا نشو ونما، اہمیت وارزش اور عروج ان باہمی دیرینہ روابط کے سبب مزید مستحکم ہوا اور شاہانہ سرپرستی ایک طرف، خود عامہ مردم ہند نے اس خارجی زبان کے کئی پہلوؤں کو ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت سے مشابہ پا کر اس کو اپنانے سے احتراز نہ کیا۔مراٹھی، ملیالم، تلگو، تامل وغیرہ میں فارسی کا نفوذ ایسا ہوا کہ آج بھی یہ زبانیں اور ان کا شعر د

ادب فارسی زبان کے نقوش سے مزین ہیں۔گو یہ اثر رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔

غزنوی امرا کے ہندوستان میں قدم جمانے کے ساتھ فارسی زبان و ادب کا بحرِ مواج اس سرزمین پر سرازیر ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دور ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی آمد اور گویا اس کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ یہ ابتدائی زمانہ بھی ایسا تھا کہ فارسی نہ صرف مرکز ہند بلکہ دکن، گجرات، بنگال، کشمیر، سندھ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے گوش کنار تک رسائی پیدا کر چکی تھی۔ بنگال جیسی دور افتادہ جگہ میں فارسی مدارس، صوفیوں کی خانقاہیں قائم تھیں اور محمد بختیار خلجی کے زمانہ سے ہی بنگال میں فارسی اپنے قدم جما چکی تھی۔

....

گورکانیان ہند یعنی مغل شاہنشاہوں نے اس ابتدا کو ایسی انتہا اور اس عروج تک پہنچایا جس کی بدولت فارسی آج بھی ہندوستانی کلچر کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔1526 عیسوی سے 1857 عیسوی پر حاوی یہ دور ہندوستان کی تاریخ میانہ کا اہم ترین زمانہ ہے۔زبان فارسی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو اس میں ہم کو چند در چند جہات نظر آتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغل دور ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے ایک پورے Spectrum کو ہمارے سامنے منتقل کر دیتا ہے۔اس قوس قزح کے چند نمایاں رنگوں کو کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

ا- یہ دور فارسی کی کلاسیکی ادبی روایت سے مکمل طور پر آشنا تھا۔ایران میں صفوی سلاطین کی شعروادب سے فی الجملہ بے توجہی کے باعث ایرانی شعرا اور ادبا کو ہندوستان آنے کی تشویق ہوئی جہاں ایک نئی، پُرشان وشکوہ، ادب نواز اور فیاض سلطنت بڑی امنگوں سے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں اپنا سکہ جما رہی تھی۔ مغل بادشاہوں خصوصاً اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے امرا کے دربار اُن باصلاحیت اور با فرہنگ آنے والوں کو اس تپاک، گرمجوشی اور فیاضی سے خوش آمدید کہتے تھے کہ وہ خود اپنے ملک کو خیرباد کہہ کر جہاں سیاسی تحولات وانتشاشات اور دینی ترجیحات ان کو ناراحت کر رہی تھیں، نانک، رحیم، کبیر، اکبر اور نظام الدین اولیا کی پرسکون، علم پرور اور ادب دوست دھرتی کو بڑی امیدوں اور آرزوؤں سے اپنا مسکن بناتے تھے۔ان کی تو مہندی میں بھی اس وقت رنگ آتا تھا جب وہ ہندوستان کی ہولی کے رنگوں سے شرابور زمین پر اپنے قدم جماتی تھی۔ 'تانیامد سوی ھندوستان حنا رنگین نشد'۔

فارسی کلاسیکی ادب کی دھاک کچھ ایسی تھی کہ غالب جیسا خود پسند اور خود اعتماد شاعر بھی جو سراسر سبک ہندی کا شاعر تھا اور عرفی، نظیری یہاں تک کہ ایک زمانہ میں بیدل تک سے رشتۂ سخن جوڑ چکا تھا، گڑ بڑا کر اپنے آپ کو ایران کے ''متقدمین'' اور ''پیشینیان'' کا پیرو بتانے لگتا ہے! فارسی ادب سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ 'متقدمین' کی اصطلاح کلاسیکی فارسی روایت کے شعرا سے وابستہ ہے، جس کا غالب کے 'طرز شعر گفتن' سے بہت کم رابطہ ہے۔ بہر حال مغل دور کا ایک رنگ کلاسیکی فارسی شاعری سے لگاؤ اور اس سے اثر پذیری تھا کیونکہ بہر حال اس وقت فطری اور لازمی طور پر فارسی شعر کا وہی Format ان کا سر مشق تھا۔

۲- لیکن اگر فقط کلاسیکی فارسی ادب کی روایت کو نمونہ بناتے رہتے تو ہندوستان کے نازک دماغ، نازک خیال، باصلاحیت، اپج پرور اور مخلوط ہند-ایرانی مرکب فرہنگی وفکری سے زائیدہ شعراو ادبا کی ذات کہاں جاتی! چنانچہ اس Specturam کا دوسرا رنگ اور اس داستان کا نیا باب شروع ہوتا ہے اور ہمارے سامنے آتا ہے: 'سبک ہندی'۔ جس کا عروج اور انحطاط دونوں ہی مغل دور نے دیکھ لیے۔ حضرات اس سبک ہندی سے متعلق میرے ذہن میں ہمیشہ اور بے ساختہ محمد حسین آزاد، شادروان وشادی بخش، کا ایک فقرہ گونجنے لگتا ہے: ''ایک نقارہ ایسا بجایا کہ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا لیکن سب واہ واہ کرتے رہ گئے!'' (اس واہ واہ سے البتہ اس دور کے ایرانی ناقد اور شیخ علی حزین کو الگ کر دیجئے گا۔) سچ یہ ہے کہ اس طرز کے لیے اس سے بہتر اور معنی خیز تر تبصرہ ہو ہی نہیں ہوسکتا۔ بہر حال مغل دور کا کلچر اس سبک وفکر جدید وتازہ وبدیع کا مشوق بنا۔ نتیجہ: اب ہندوستان کے فارسی ادب کا اپنا الگ وجود مانا گیا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ آسیائی مرکزی کے وہ ممالک جہاں کی قومی ونژادی زبان فارسی رہی اور ہے، تاجیکستان، افغانستان، ازبکستان وغیرہ اور جن کو ایران میں بڑے احترام اور دوستی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، شعر وادب میں اپنی مقامی Idiom کو استعمال کرنے کے علاوہ کسی جدید اہم اور معنی خیز سبک اور طرز کے بانی نہ بن سکے۔ یہ امتیاز ہندوستان کو حاصل ہوا۔

۳- سرکاری، درباری، اداری، ادبی، خانقاہی، شہری (Civil) قانونی اور ہندوستانی زندگی کے بے شمار دیگر پہلوؤں میں فارسی اصطلاحوں کے ورود کے باعث اس زبان کا اثر ونفوذ ہندوستان کی مقامی زبانوں تک پہنچ گیا اور ہندوستان کے کلچر میں رس بس گیا۔ یہ اثر ونفوذ آج بھی

دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ایک الگ داستان ہے۔

۴- مغل دور کے اواخر میں فارسی اور سبک ہندی کا انحطاط دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ بھی اِسی Spectrum کا ایک رنگ ہے۔ ایک ہندی کہاوت ہے جس کو اگر قرۃ العین حیدر جیسی دانشور ادیب استعمال کرسکتی ہے تو میں بھی اجازت چاہتی ہوں: 'ان کرموں کے یہی پر یکھ - وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ!'' بلندش بغایت بلند اما پستش بغایت پست است ' یہ معروف فقرہ اسی غریب سبک ہندی کی شان میں کہا گیا ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو کاملا درست ہے۔ اسی دور میں خصوصاً مغل دور کے اواخر میں، سبک ہندی کے شعرا نے اس طرح برگ گل سے بلبل کے پر باندھے اور لفظی گورکھ دھندے تخلیق کیے جن کا پہلا شکار خود فکر و معنی ہوگئے۔ ایسی ایسی عبارت پردازیاں ہوئیں اور فارسی کو مقامی زبانوں کے اصطلاحات و افعال سے ایسا مخلوط کیا گیا کہ 'بوی کچوری می آید' کا واہیات لیکن حقیقت سے قریب جملہ اس کی مصداق بن گیا۔

یقیناً یہ طریقہ Chaste اور فصیح فارسی اور سعدی و حافظ و صائب و نظیری و عراقی کے Discourse سے نہ صرف مختلف تھا بلکہ شاید کچھ مضحکہ خیز اور توہین آمیز بھی۔ بہر حال اگر اجازت دیجیے اور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ اس سب فقرہ بازی اور اخلاط و تخلیط وانتہا پسندی اور بدسلیقگی کے باوجود اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ 'ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی'۔ بہت خوب۔ غالب کو اعتراض ہے تو ہو کم سے کم اس سے حسن کے پرستار تو بڑھے! عرض مدعا یہ ہے کہ یقیناً فارسی کی اس صلای عام میں بدسلیقہ لوگ بھی شامل ہوگئے جن کو اس شاہی دستر خوان پر کھانے کی تمیز چنداں نہ تھی لیکن کم سے کم یہ تو ہوا کہ یہ دعوت خواص سے عوام تک پہنچی اور عوام ہی جس چیز کو زندہ رکھتے ہیں وہ زندہ رہتی ہے۔ چنانچہ فارسی بھی زندہ رہی۔ پس ہندوستان میں فارسی کی بقا میں ہر بڑے چھوٹے کا ہاتھ رہا اور ہے۔ یہی سبب ہے کہ زمین و آسمان بدل جانے کے باوجود فارسی زبان اس ملک میں داستان پارینہ نہیں بنی۔

۵- مغل دور کا ایک سرا اگر بابر، ہمایوں اور اکبر جیسے فارسی دوستوں اور علم و ادب پروروں کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو بدبختی سے اس کا دوسرا سرا ان تاجروں کے ساتھ جن کے لیے ہندوستان فقط ایک ''سونے کی چڑیا'' تھی، تصوف و عرفان و عشق و ہم آہنگی واتحاد وانسان دوستی کی سرچشمہ نہیں۔ بظاہر دونوں اقوام خارجی تھیں لیکن ایک نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس

کے شاہنشاہوں اور امرا نے اس زرخیز ملک کے وسائل و صنایع کو اس کی سرحدوں سے باہر نہیں بھیجا بلکہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا۔ دوسری نے ''نمک پروری و کتان بافی'' تک ممنوع قرار دی۔ بہر حال 1857 کی فیصلہ کن جنگ آزادی نے مغل تاجداروں کے سلسلے کو ختم کیا اور تاجر قوم بادشاہ بن بیٹھی۔

ظاہر ہے اس اتار چڑھاؤ، سیاسی بحران کا اور Exchange of Power کا شکار مغل کلچر کے ساتھ ساتھ وہ زبان بھی ہوئی جس کو سرکاری اور ادبی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ 1837 میں ایک اعلامیہ کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی فارسی کا سرکاری اور رسمی درجہ ختم کر چکی تھی۔ 1843 میں اس کو ''زبان عقیدتی میراث اور فرہنگی'' کا درجہ دے کر گویا Main Stream سے الگ کر دیا۔ 1862 میں ایک فرمان کے تحت دولتی و عدالتی اداروں میں اس کا استعمال منسوخ ہو گیا۔ ملک کا کاروبار اب انگریزی اور دوسری زبانوں میں انجام پانے لگا۔ لیکن فارسی زبان و ادب صدیوں سے ہندوستان میں کچھ اس طرح ریشہ گیر ہو چکے تھے کہ اس بحرانی کیفیت اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود اس کی بیخ کنی نہ کی جا سکی۔ خود انگریز قوم میں فارسی کے دوست دار موجود تھے جو اسکی سرکاری حیثیت کے منکر ضرور تھے لیکن اس کے شعر و ادب کے ذخائر کی قدمت و وسعت و اہمیت کے معترف تھے اور بقیہ کارمندان دولتی کو بھی معلوم تھا کہ فارسی جانے بغیر وہ نہ پرانے رکارڈ اور تاریخیں اور فرامین پڑھ سکتے تھے نہ ان کا ترجمہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ فارسی کی تدریس خاصی حد تک باقی رہی۔ خود وارن ہیسٹنگز نے فارسی میں مہارت پیدا کی اور بے شمار انگریز اسکالروں نے فارسی متون کی تدوین اور ترجمہ کا کام انجام دیا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا وجود انگریزوں کا مرہون منت ہے۔ آزادی سے پہلے نول کشور پریس نے فارسی زبان و ادبیات کی لازوال خدمات انجام دیں۔ ہندوستان میں ایران سے پہلے چاپخانہ قائم ہوا یعنی 1802 میں۔ چنانچہ فارسی کے متون کلاسیکی ایران سے پہلے ہندوستان میں شائع ہوئے۔ مثلاً شاہنامہ۔ انگریزی حکومت کے آخری سالوں میں مقامی زبانوں، ہندی اور انگریزی کے فروغ، اردو زبان کے ارتقا اور کئی دوسرے عوامل کے سبب فارسی کو لطمہ پہنچا لیکن یہی وہ دور بھی ہے جس میں اس زبان نے عصری ضرورتوں اور تقاضوں اور مزاج کے مطابق نئے نئے روپ اختیار کرنا شروع کیے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز:

حصول آزادی سے قبل انگریزوں سے وابستگی اور انگریزی زبان وادب سے آشنائی ہندوستانیوں کے لیے ناگزیر تھی۔ اس کا ایک مثبت اثر یہ برآمد ہوا کہ ہمارے دانشوروں اور ادیبوں نے نئے میدانوں ، Fresh Pastures کو دریافت کیا۔ Literary Researches،Literary Criticism، تعلیمی وتدوینی متون،Critical Editions،زبان شناسی ،آواشناسی ،زیبائی شناختی،Aesthetics مغربی ادب کی T.S.Elliot،Literary Canons کا نقد ادبی کا رویہ، Henry James ،Stylistics کی اسلوبیاتی تنقید اور بے شمار دوسرے Point of Views کے بارے میں اطلاعات اور سمجھ پیدا ہوئی۔ سادہ نویسی کی اہمیت واضح ہوئی۔ متن کے مافی الضمیر کو دریافت کرنے، متن کی درستی کو پرکھنے کے پیمانے، پارہ ادب کے سیاق وسباق کی صحیح تحقیق کرنے کے اور اس کے درست انتساب کے طریقے اور روش متعین اور معلوم ہوئے۔

خود ایران نے بھی انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے آغاز میں مغربی روشہای ادبی ،نقد ادبی اور سبک شناسی کا اثر قبول کیا تھا۔ امیر کبیر، قائم مقام، ادیب الممالک فراہانی، طالبوف، دھخدا وغیرہ سادہ نویسی اور مغربی طرز ادب سے متاثر ہوئے۔ بعد میں بہار، سعید نفیسی، محمد علی فروغی اور تقریباً ہر ناقد ادیب اور محقق نے مغرب کے طرز تحقیق ،اور روشِ تنقید کی تاسی پسند کی۔ ہندوستان میں بھی انیسویں صدی تحولات ادبی کا زمانہ تھا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے اردو فارسی میں سادہ نویسی کی شدید حمایت کی۔ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی وغیرہ نے فارسی تحقیق وتنقید میں جدید طریقے متعارف کیے جن کی بنیاد مغربی اصول وموازین پر تھی۔ 'مقدمہ شعروشاعری' اور 'شعرالعجم' اس نوعیت کی اولین کوششیں مانی گئی ہیں۔ حالی تو اس روش سے ایسے متاثر تھے کہ وہ ''مقدمہ'' میں گویا ہماری توجہ اس بات کی طرف مبذول کروانے کے لیے کہ یہ طرز نقد نیا ہے، جا بجا انگریزی اصطلاحوں کا استعمال کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے نیمہ' آخر یعنی 1947 میں ملک کو آزادی حاصل ہوئی ۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے آزادی خواہ اور سیاسی رہبر فارسی کے دوست داروں میں شامل تھے اور انھوں نے ملک کے جدید نظام تعلیم ، دانشگاہوں، ریسرچ کے اداروں، مختلف فرہنگی و ادبی انجمنوں میں فارسی کی شمولیت کی طرف خصوصی توجہ کی۔ نہرو ابتدا سے ایران اور ہندوستان کے قدیمی روابط کے معترف اور معتقد تھے اور اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں تفصیل سے ان کی

طرف توجہ دلوا چکے تھے۔ 1959 میں دانشگاہ تہران سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی تفویض کے وقت انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات کا پورا اطمینان دلوایا کہ وہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں فارسی کے شعبے قائم کریں گے۔ اور ایسا ہوا بھی۔ نہرو کے علاوہ گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا ابوالکلام آزاد جو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے، فارسی کے دلدادہ تھے۔ مولانا کی معروف تالیف غبار خاطر کا مطالعہ کیجیے تو قدم قدم پر فارسی اشعار و ترکیبات دکھائی دیتے ہیں جن کا استعمال ایسا خوبصورت اور برمحل ہے کہ مولانا کی نثر کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید نفیسی نے مولانا آزاد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فارسی زبان پر قدرت رکھتے تھے اور بے تکان بول لیتے تھے ۔سعید نفیسی فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے نحوی اور ملاح کا قصہ انھیں سنایا۔ قصہ سن کر کہا یہ حکایت مولانا روم کی مثنوی میں ہے اور پوری حکایت منظوم مجھے سنا دی۔ مولانا آزاد نے ''فرہنگ جدید'' کے نام سے ایک لغت بھی ترتیب دی تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی لغت نویسی کی 'کچھ عجیب حالت رہی ہے'!۔ مولانا کی وزارت کے دوران ملک میں کئی یونیورسٹیوں میں فارسی کے شعبوں کا قیام ہوا۔ ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مدراس یونیورسٹی شامل ہے۔

سیاسی راہنماؤں نے اگر فارسی کے مراکز اور دانشکدہ وغیرہ قائم کرنے میں اقدام کیے تو فارسی اسکالرز نے اس دور میں انتہائی تندہی، محنت، جوش اور جذبہ کے ساتھ فارسی زبان و ادب کے فروغ و گسترش اور ہندوستان میں اس زبان کے ماضی اور اس کی روایت کو زندہ اور برقرار رکھنے کے لیے بیش بہا اور بے شمار خدمات انجام دیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ باوجود ناسازگار احوال کے ہندوستان میں آزادی کے بعد بھی فارسی کی اہمیت برقرار رہی البتہ اس کا نہج، ہدف اور دائرۂ کار بدل گئے۔ اب جدید معائیر و موازین کی مدد سے فارسی زبان و ادب کے صدیوں پرانے خزانے کی 'بازیافت' یا 'نو دریافت' کا وقت آیا۔ اب فارسی میں تخلیق ادب تو کم رہی لیکن تحقیق و تدوین و تنقید و تدریس کے جدید طریقوں سے فارسی زبان و ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کا آغاز ہوا۔ وہ زبان جو صدیوں سے ایران و ہندوستان کی مشترک میراث تھی اور شعر و نثر کی وہ بے بہا وراثت جس میں خود ہندوستانی ادبا اور شعرا کا معتد بہ حصہ تھا اب سنجش و تحلیل و تجزیہ کے معرض میں قرار پائے۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق، قاضی عبدالودود، وحید مرزا، حسن عسکری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر ہادی حسن، پروفیسر منیب الرحمٰن، پروفیسر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر رضیہ اکبر،

پروفیسر نبی ہادی، پروفیسر وارث کرمانی اور دوسرے معزز اساتذہ نے اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کا نام ان اساتذہ میں سرفہرست ہے۔ ہند و ایران کے روابط کی کہنگی، گونا گونی اور معنی خیزی سے ان کی مکمل واقفیت اور ہندوستان میں فارسی زبان کے ماضی، اس ملک کی تاریخ و فرہنگ میں اس کے زبان و ادب کی غیر معمولی شمولیت سے آگاہی کے سبب انھوں نے فارسی زبان و ادب کی خدمت کو اپنا اہم فریضہ جانا۔

شہرۂ آفاق محقق، ناقد، زبان شناس، شعر فہم، عروض داں، متخصص تاریخ و تمدن و فرہنگ، دانشور، لغت داں، حافظ شناس، ماہر غالبیات، متن تحقیقات کا بوطیقا ترتیب دینے والے، ایران شناس، انسان دوست اور ایک مشفق استاد۔ یہ تمام صفات بھی نذیر صاحب کی ذات اور خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔

سمندر کو کوزہ میں بند کرنا تو شاید ممکن ہو لیکن نذیر صاحب کے علمی کارناموں اور فارسی ادب کے لیے ان کی بے بہا خدمات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ انھوں نے فارسی کے سیکڑوں موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہر موضوع پر ٹھوس، معتبر اور اچھوتا مواد فراہم کیا۔ ان کی حیثیت ایک تاریخ ساز محقق اور نقاد کی ہے جس نے فارسی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ لسانیات، ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کو بھی اپنے دائرۂ کار میں شامل کیا۔ تدوین متن کے سلسلے میں انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے متنی تحقیق و تنقید کے اصول و ضوابط مرتب ہوتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ تصحیح متن اور تنقید و تحقیق کو ایک جاری و ساری عمل سمجھتے ہیں۔ ان کی عالمانہ بصیرت کا سب سے بڑا اور اہم پہلو فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں ان کی گہری بصیرت ہے۔ وہ علم زبان کے ماہر اور فارسی زبان کے ارتقا سے کماحقہ واقف تھے۔ ہر دور کی زبان کے خصایص پر ان کی گہری نظر نے ان کے اندر غیر معمولی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ شاعر یا ادیب کے کلام سے وہ اس کے عہد کا تعین کر سکتے تھے یہاں تک کہ وہ ایک ہی شاعر کے ابتدائی دور کے کلام اور اس کے آخری دور کے کلام میں فرق کر سکتے تھے اور اس کے ذریعہ زبان کے ارتقا کی جھلکیاں دکھا سکتے تھے۔ اسی بنا پر ان کا یہ پختہ خیال تھا متون کی تصحیح و تدوین کے لیے ہر دورۂ ادبی کے سبک سے آشنائی واجب ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مصحح صحیح نسخہ بدل انتخاب نہیں کر سکے گا۔ مثلاً ایک مقالے میں فرمایا ہے:

"مصحح کو چاہیے کہ وہ اس بات کی طرف متوجہ ہو کر قدیم ادوار کی فارسی

زبان میں بعض اوقات فارسی قیود کی جگہ ان کا عربی معادل استعمال کے جانے کی روایت رہی ہے۔ مثلاً ''سخت'' کی جگہ ''صعب'' کہتے تھے۔ ان دونوں کے وزن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شہید بلخی کی اس بیت میں

مرا بہ جان تو سوگند و صعب سوگندی
کہ ہرگز از تو نگردم نہ بشنوم پندی

اس بیت میں صعب کی جگہ 'سخت' کا استعمال کرنا غلط ہوگا۔

اسی طرح بلعمی نے جنگ کی جگہ حرب کا لفظ استعمال کیا ہے اس کی تاریخ میں ایک جگہ ''جنگ'' کا لفظ آیا ہے۔''[1]

بلعمی کی مبسوط تاریخ کی اس دقت نظری کے ساتھ بررسی کرنا کہ یہ عدد یادر ہے صرف ان کا ذہن بیدار ہی کر سکتا تھا۔

فارسی ادب میں تبصرہ ونقد شروع تو شاید عوفی، نظامی عروضی، دولت شاہ، رشید وطواط، سراج علی خان آرزو اور غلام علی آزاد بلگرامی سے ہو چکا تھا لیکن اس کی حیثیت ابتدائی نقوش کی تھی۔ کسی منظم سسٹم اور جانے بوجھے، متعین شدہ اور Accepted اصول وضوابط کے تحت نہیں۔ نقد و تبصرے اور تحقیق وتدوین کے مغربی موازین ومعائیر کی مدد سے شعروادب کے اس لازوال ذخیرہ کی تہہ تک پہنچنا، زبان شناسی اور سبک شناسی کے مختلف مدارس فکر اور Points of Views کے پیمانے پر ان کو پرکھنا اور تدوین متون کے بحر زخار کو استادانہ طریقے سے طے کرنا نذیر صاحب ہی کا حصہ ہے۔ یہ فارسی کی زبردست خدمت تھی۔ کیا ہم فردوسی کے شاہنامہ، سعدی کی گلستان، رومی کی مثنوی، حافظ کی غزل، سبک ہندی کے شعر، آرزو کے مثمر، بیدل کی ابیات اور قدیم قلمی نسخوں کے متن کو اس طرح سمجھ سکتے تھے جس طرح آج نذیر صاحب کے اصول تحقیق وتنقید کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں؟ یا شاہنامہ، گلستان، رباعیات خیام، حافظ، امیر خسرو کے کلام میں کتنا الحاقی کلام ہے اس کا منطقی اور تخریجی تجزیہ ان کی رہنمائی کے بغیر کیا جا سکتا تھا؟ یقیناً نہیں۔ بے شک عین القضاۃ نے شعر کو ''آئینہ'' کہا تھا۔ لیکن اس آئینے سے اس کی مراد کیا تھی یہ آشنائی ہم کو نذیر صاحب کے متعدد تحقیقی کارناموں کے وسیلے سے حاصل ہوئی۔ شعر یا نثر پارہ کی خوبی وخامی، اس کی جاذبیت یا ابتذال دلکشی وغیرہ کا ایک جبلی اور فطری حس کے تحت ادراک کر لینا دوسری بات ہے لیکن با قاعدہ اس کی

شعریات Aesthetics مرتب کرنا قطعاً دوسری۔ ابن خلدون اور بوطیقا کے مقام اور ان کی معنویات کی تصریح وتوضیح کی ضرورت تھی اور ہے۔ لیکن عملی طور پر اس کا ادراک و افہام نذیر صاحب کی تحقیق وتنقید کی بررسی سے ممکن ہے۔

ابیات کا ترنم اور الفاظ کی نشست و برخاست کی اہمیت زمانہ گذشتہ میں شاید عروض کی بحور و اوزان تک محدود رہی ہو لیکن بیت ذیل میں 'Rythm' اور ترنم الفاظ کی ماہیت اور جہات کس طرح مرتب ہوں گی اس کا پتہ لگانا نذیر احمد صاحب جیسے زباں شناس اور لغت داں ہی کے امکان میں تھا جیسا انھوں نے اپنے مقالے میں کیا ہے:

نسیم خلد ومی زند مگر ز جوئبارھا
کہ بوی مشک می دھد ھوای مرغزار ھا

دیوان حافظ کی تدوین میں انھوں نے جس دقت نظری اور انتخاب الفاظ کے جس سلیقے کو برتا ہے وہ صرف ان کے جیسا عالم ہی کر سکتا تھا۔

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق ومعشوق راز دارانند

یا

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق ومعشوق راز دارانند

حافظ کی اس بیت کی مندرجہ بالا دونوں قرأتوں میں سے کیا قرأت ہونی چاہیے اور کیوں، اس کا جواز پروفیسر نذیر احمد جیسے حافظ شناس اور زبان دان ہی کر سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ یہ زمانہ فارسی شعرو ادب کی تخلیق کا زمانہ نہیں لیکن اس کی طلسم کشائی کا عصر ضرور ہے۔ اور وہ طلسم کشا ہیں پروفیسر نذیر احمد:

هیچ گه ذوق طلب از جستجو بازم نداشت
دانه می چیدم من آن روزی که خرمن داشتم

نذیر صاحب کی تحقیق وتدوین کا میدان ایسا وسیع ہے کہ اس کو سر کرنے کے لیے کیسی اور کتنی شرائط مقرر ہوں یہ طے کرنا آسان نہیں۔ یہاں ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کرنا منظور

ہے۔ ہر متن کی اپنی تاریخ، اپنا پس منظر، اپنا Norm ہوتا ہے، وہ Norm ہر ادب پارہ کو دوسرے پارۂ ادب سے جدا کرتا ہے۔ یہ Norm ہی ہے جس کی درست تفہیم سے خوانندہ ایک شاعر یا ادیب کی تحریر کو ایک دوسرے سے مختص اور الگ کرسکتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو سعدی کی ابیات کو حافظ کی غزل سے ممتاز کرتی ہے؟ اور وہ کون سے خصایص ہیں جو صائب کو عرفی سے جدا کرتے ہیں؟ موجودہ دور میں Stylistics ایک انتہائی وسیع اور اہم پیمانہ ادب ہے جس کی متنوع اور بعض اوقات متخالف جہات ہیں۔ ہندوستان اور ایران سے بہت پہلے انگلستان میں 1846، فرانس میں 1872، جرمنی میں انیسویں صدی کے اواخر اور ایران میں بیسویں صدی مے بہار کی سبک شناسی سے اس کی ابتدا ہوئی۔ شاید اس کی بالکل ابتدائی شکل خان آرزو کی مثمر اور آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان کو کہا جاسکتا ہے۔ نذیر صاحب کی دقت نظری اور دوررسی اس میں ہے کہ مخطوطوں اور متون کی شناخت کے لیے انھوں نے Stylistics کے علم کی ایک ایسی بنیادی چیز کا انتخاب کیا ہے جس سے بہتر پیمانہ اور آئینہ ان کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو Modern Critics کی نظر میں سب سے محترم اور سب سے اہم ہے یعنی زبان اور کاربُرد الفاظ۔ ادب کا یہ پہلو اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ موجودہ دور میں Literary Stylistics کے مقابل Linguistic Stylistic کا مدرسہ نقد وجود میں آکر ترقی پا چکا ہے جس میں ناقد اور محقق زبان یا Code یا نظام زبانی کے ذریعہ متن کی شناخت اور اس کے زمانہ کا تعین اور Appreciation کرتا ہے۔ مارسل پراؤست لکھتا ہے "زبان نویسندہ کے ذہن کی آواز ہے"۔ وہ معتقد ہے کہ زبان کسی تحریر پر عارض نہیں ہوتی، اسکا مادہ اور جوہر اور اصل ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ فکر کو سمجھنے کی کلید بھی زبان میں ہے۔ Cardinal Newman قائل ہے کہ مادہ اور بیان ایک ہیں اور تخیل اور فکر ایک خاص شیوہ نوشتن میں ظاہر ہوتا ہے۔

فارسی ادب میں نذیر صاحب Linguistic Stylistics کے بنیانگزاروں میں سے ہیں۔ متن کو وہ زبان کے Code سے سمجھتے ہیں، اس کی صحت زمانی و مکانی کا تعین فرماتے ہیں، اس کے انتساب کی درستی اور نادرستی کا پتہ لگاتے ہیں اور لکھنے والے کے کلام و بیان کی خصوصیات کی تہ تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اس اسوہ پر عمل کرنے اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے کس قدر علم، زبان و بیان کی تاریخ پر نظر، لغت شناسی اور زبان شناسی میں مہارت درکار ہے۔ معروف ناقد

شارل بالی کی نظر میں یہ طرز نقد و تحقیق اتنا اہم تھا کہ اس نے کوشش کی کہ سبک شناسی کو زبان شناسی کی شاخ قرار دیا جائے۔ زبان شناسوں کے مطابق ہر فکر کا Clue، خواہ وہ مابعد الطبیعاتی ہو یا مادی، زبان کے Code میں مضمر ہے۔ آج ایران میں ناقدین زبان شناختی پر مجلدات تحریر کر رہے ہیں:

"روز بروز سبك شناسی از حوزه نقد ادبی قدیم خارج شد و به طرف زبان شناختی رفتند به طور یکه امروز سبك شناسی نیست که به نقش زبان شناسی اعتنا باشد. سبك شناسی به کاربرد اصول زبان شناسی بعد ادبی اطلاق می گردد."[۲]

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس وقت اس بات کو اپنے وجدان درست سے سمجھ لیا تھا۔ وہ لغت شناس تھے الفاظ کی Etymology اور ان کے سفر او ارتقا سے کماحقہ واقف تھے۔ دیوان حافظ کی تحقیق، مکاتیب سنائی کی تصحیح و ترتیب، دیوان سراجی کی تدوین یا غالب کی نثر و نظم، ان سب کے بنیادی اصول انھوں نے زبان شناسی سے مرتب کیے ہیں۔ غالب کے ایک شعر میں مرزا کے معروف مصرع 'بگذر از مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است' میں 'بیرنگ' کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے نذیر صاحب فارسی کی قدیم و جدید لغات کا حوالہ دیتے ہیں مثلاً دہخدا، بہار عجم، فرہنگ آنندراج، فرہنگ رشیدی وغیرہ، متقدمین فارسی کے کلام سے مثالیں لاتے ہیں اور پھر نتیجہ نکالتے ہیں جو ان کے بے مثل زبان شناس، لغت دان، سخن شناس، ماہر مورخ ادب و دستور زبان ہونے کا شاہد ہے:

"بہ لحاظ قواعد یہ کلمہ اسم فاعل ہے اور استعمال میں صنف کے طور پر آتا ہے۔ مثلاً کلام بے رنگ، شعر بے رنگ، گل بے رنگ وغیرہ۔ ہاں بیرنگی اسم مصدر ہے اور اس کا استعمال طور مضاف ہوگا۔ اس شعر میں بیرنگ من کے معنی ہوئے میرا خاکہ اور غالب کے ذہن میں یہی معنی ہیں۔ اس کا اصلا بیرنگ ہونا چاہیے، بے رنگ نہیں۔"[۳]

غالب کی نثر کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ ان کی 'الفاظ تراشی' کو ان کی صلاحیت پر محمول اور اس کو پسند کرتے ہیں:

"فارسی نثر کا مروجہ اصول تھا کہ اس کی زبان معلق ہو اور عربی الفاظ و

فقرات سے بوجھل۔ غالب نے اس روش سے سراسر علیحدگی اختیار کی۔
انھوں نے یہ راہ نکالی کہ عربی الفاظ وتراکیب صرف انھی صورتوں میں
استعمال کیے جائیں جہاں ان کے لیے فارسی کے الفاظ موجود نہ ہوں اور
نہ انھیں تراشا جاسکتا ہو۔ اس کے لیے ظاہر ہے ہزاروں الفاظ تراشنا
تھے۔ لیکن غالب نے یہ چیلنج قبول کیا اور نہایت کامیابی سے اس سے عہدہ
برآ ہوئے۔''[۴۴]

اس مقالے میں انھوں نے غالب کے اسلوبیات سے بھی بحث کی ہے۔ حرکیات کی تشکیل، نئے الفاظ کی تراش خراش، عبارت کا دروبست، انتخاب الفاظ کے حوالے سے نذیر صاحب نے وہ خاکہ تیار کر دیا ہے جو غالب کے اسلوب کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ منفرد لسانی اور اسلوبیاتی خصایص کو مشخص کرنا اور ان مشخص شدہ خصایص سے شاعر یا نثر نگار کے سبک کی تعین اور شناخت کر کے اس کی منفرد حیثیت کو سمجھنا کس قدر دشوار امر ہے۔ لیکن زبان، تراکیب لغوی ومجازی، الفاظ کے استعمال کا طریقہ اور ارتقا و تکامل زبان پر پوری گرفت اور گہری دلچسپی کے نتیجہ میں نذیر احمد صاحب کے لیے شعر ونثر میں شناخت کا مسئہ ان کی نکتہ آفرینی اور دائرۂ کار کا نقطۂ ارتکاز ہے۔

کلاسیکل فارسی زبان و بیان سے متعلق بے شمار معتبر اور دقیق اطلاعات ہم کو پروفیسر نذیر صاحب کی تحریروں میں دریافت ہوتی ہیں: کبھی تعلیقات وحواشی کی شکل میں، کہیں مستقل مقالے کی صورت میں، کہیں اشارہ اور اضافہ کے بطور۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

دال فارسی ، الف اطلاق، کسرۂ اضافہ، تغییر مصوتہ، امالہ، اعراب، فتحہ بجای کسرہ، تشدید مخفف، ضمیر، اسامی، مصادر، نون غنہ، ساختن مصدر با یای مصدری عربی، کثرت، حرف 'گاف' پیشوند وپس وند، واو عطف، واو معدولہ، قید، 'ذ' عدد، فاصلہ بین اسم وفعل، انواع 'ی' وغیرہ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا نذیر احمد صاحب کی تحقیق وتنقید کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ وہ فارسی زبان اور علم وادب کے متعدد اور گوناگوں نکات سے ہم کو آشنا کروائیں بلکہ ان کی خاص توجہ اس امر کی طرف بھی تھی کہ ریسرچز کے ذریعہ اس بات کو کماحقہ واضح کیا جائے کہ اس زبان کا ہندوستان کی

تاریخ، تمدن، السنہ، ادب اور عام زندگی میں کتنا اہم حصہ رہا ہے۔ ان کے آثار وافکار و مقالات کا جائزہ لیجئے تو یہ بات بطور خاص واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ہندوستانی معاشرہ اور ہندوستانی زندگی سے فارسی کے اس تنگا تنگ رابطہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جو صدیوں تک استوار رہا اور جو آج بھی روز روشن کی طرح اپنا وجود تسلیم کروا رہا ہے۔ نذیر صاحب نے فرمایا ہے:

''ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے چھ سو سالہ تسلط کا زمانہ نہ صرف ہندوستانی تمدن اور سیاسی تاریخ کا اہم باب ہے بلکہ اس نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ اگر چہ اس کے دور تسلط کو ختم ہوئے ایک طویل عرصہ گذر چکا ہے لیکن یہاں کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر اس کے اثرات ونقوش تازہ ہیں۔''[۵]

وہ اپنے مختلف مقالوں میں ان اسباب وعوامل کا مفصل ذکر کرتے ہیں جو ہندوستان میں ایرانی زبان اور ایرانی تمدن کے غیر معمولی نفوذ کا باعث رہے ہیں۔

''فارسی کے اثرات ہندوستان کے تمدنی وتہذیبی امور پر'' اس عنوان کے ذیل میں پروفیسر صاحب نے ان بے شمار اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستان کی مشترک تہذیب کا نمونہ تھے اور ہیں۔ اپنے ارشادات میں انھوں نے ہماری توجہ خصوصی طور سے ان فارسی کتبات کی طرف بھی دلوائی ہے جو بقول ڈاکٹر صاحب کے ہندوستان میں فارسی کے نفوذ کی زندہ اور برجستہ مثال ہیں۔ ان کتبات کو وہ چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

☆ شاہی عمارتوں پر پائے جانے والے کتبات منظوم ومنثور جن میں عموماً مادہ تاریخ بھی پایا جاتا ہے۔

☆ مدارس، مساجد، بزرگان دین کے مزاروں پر کندہ احادیث، آیات، اشعار وعبارات مع مادہ تاریخ۔

☆ پلوں، بازاروں، چشموں، کنوؤں وغیرہ پر کندہ فارسی عبارت۔

☆ بادشاہوں، امرا، وزرا، شعرا اور دیگر لوگوں کے مزاروں پر موجود کتبات۔[۶]

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے فارسی کتبات پر جو سیر حاصل مواد فراہم کیا ہے اور ہندوستان کی تاریخ ومعاشرت کا جو مطالعہ ان کی روشنی میں انجام دیا ہے اس سے یہ نتیجہ صاف طور

پر نکالا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی و تمدنی تاریخ کے استیعاب کے لیے فارسی کتبات کس قدر اہم ہیں۔ان کا فرمانا ہے:

''جب تک ان تاریخی ابنیہ وغیرہ کا وجود باقی ہے، فارسی زبان کا ہندوستان سے تعلق برقرار اور باقی رہے گا۔ یہ کتبات نقش الحجر نہیں بلکہ واقعی نقش بر حجر ہیں۔''[7]

انھوں نے فارسی کے پروانوں، شاہی فرامین، سندوں وغیرہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ان کا عقیدہ ہے کہ:

''آرکائیوز سے متعلق فارسی مواد کی کثرت کے اعتبار سے ہندوستان کا پلہ خود اپنے وطن ایران سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔''[8]

ان کے مقالات اور تالیفات و تصنیفات ہندوستانی مصوری، فن تعمیر، موسیقی، خطاطی ،طب ،نجوم، شعر و ادب ،فکر عرفانی وغیرہ پر ایرانی اور فارسی اثرات سے متعلق بیش بہا اور نادر اطلاعات کی دستاویزات ہیں۔تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب کا میدان زبان و ادب تھا، فارسی زبان و ادب۔لیکن مندرجہ بالا ہر فن پر لکھے جانے والے ان کے مقالات کو پڑھیے تو یہ احساس کیجیے گا گویا انکا لکھنے والا خاص اسی فن اور اور اسی موضوع کا ماہر ہے۔شبیہ کشی سے متعلق ''مرقع گلشن'' پر اسلامک کلچر میں شائع ہونے والا ان کا مقالہ جس میں انھوں نے دربار جہانگیری سے وابستہ معروف مصور اور نقاش فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شبیہ پر یوروپین نقاد رابرٹ اسکلٹن اور لیو برہچک کی آرا کی تردید کی ہے، نذیر صاحب کو فن مصوری کا عمدہ ناقد قرار دیتا ہے۔

ہندوستانی معاشرہ پر فارسی زبان کے اثرات کا ذکر انھوں نے بہت تفصیل کے ساتھ ،الگ الگ عنوانات کے تحت کیا ہے۔ مثلاً فارسی زبان پر مبنی: افراد کے نام، رشتوں ،عہدوں، عہدہ داروں، خطابات ،رسوم و رواج، کھانوں اور پھلوں اور پھولوں کے نام، شہروں کے نام (آباد پر ختم ہونے والے، 'گنج' پر مشتمل، باغ پر ختم ہونے والے، سرائے پر مشتمل، 'پور' پر ختم ہونے والے)،اعضای جسمانی، ظروف، جانوروں کے نام، کلمات تحسین، کلمات مذمت ، گالیاں، سواری اور سفر سے متعلق اصطلاحات، پیشہ وروں کے نام، زراعت کی اصطلاحیں، عدالتی

وقانونی اصطلاحات، تحریر وکتابت کی اصطلاحات، تجارتی کے متعلقات، معماری کے سلسلے کے الفاظ، طب، موسیقی، مصوری کی اصطلاحات، پیمانے وغیرہ۔ بڑی دقت نظری سے انھوں نے ان عنوانات کے تحت بے شمار مثالیں دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ کس طرح فارسی کا گرم وجان بخش لہو ہندوستانی کلچر اور کلچرل diction میں رواں دواں ہے۔

اس کے علاوہ متعدد مثالوں کے ذریعہ انھوں نے اردو اور ہندوستانی بول چال میں فارسی کے سینکڑوں مستعمل کلمات، فقرے، ضرب الامثال اور محاوروں کی طرف توجہ دلوائی ہے۔ نذیر صاحب نے ہندوستان کی زبانوں پر، بشمول شمال وجنوب، فارسی کے گہرے نقوش ثابت کر دکھائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ دراوڑی زبانیں مثلاً تامل، تیلگو، کنڑ ملیالم اور بروہی وغیرہ بھی فارسی کے حلقہ اثر میں ہیں۔ انھوں نے اردو ہندی، پنجابی، بنگالی اور کشمیری کا خصوصی تذکرہ اس ضمن میں کیا ہے۔ بہت تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ انھوں نے ہندی اور اردو پر فارسی کی قواعد کے اثرات کو سلسلہ وار بیان کیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

> اردو اور ہندی کے اکثر صفات فارسی سے ماخوذ ہیں اور ان سے اسم کیفیت بنانے کا قاعدہ یکساں ہے۔ یعنی ''ی'' کے اضافہ کے ساتھ۔ مثلاً ''آباد = آبادی''، 'بہادر = بہادری'، 'برابر = برابری' وغیرہ۔

فارسی حاصل مصدر کثرت سے مستعمل ہیں: مالش، سفارش، بارش، خواہش، نالش وغیرہ۔

مصادر فارسی الفاظ سے بنائے گئے ہیں: آزمانا، خریدنا، تراشنا، لرزنا، گزرنا، بدلنا، شرمانا وغیرہ۔

مرکبات: دل جلا، سرپھرا، اٹھائی گیرا، گھڑسوار وغیرہ۔

اسم مفعول = شادی شدہ وغیرہ۔

ہندی الفاظ میں فارسی پیشوند و پسوند Prefix, Suffix

پاندان، سرمہ دان، پاگل خانہ، چنڈو خانہ، بے ڈھب، چھاپہ خانہ وغیرہ۔9

ان کے آثار ومقالات کی اہمیت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ

وہ عام ہندوستانی تک پہنچ سکیں تا کہ وہ فارسی کو بیگانہ نہیں اپنا مانے۔

زبان کے علاوہ ہندوستان میں تخلیق ہونے والے مختلف زبانوں کے شعروادب نے براہ راست فارسی شعروادب سے کس طرح اپنی اصناف، اپنے شعری وادبی محاورہ اور شعر کے محیط و ماحول کو فارسی کے رنگ سے رنگا ہے اس پر انھوں نے کثرت سے لکھا ہے جس سے جدید ہندوستان میں فارسی کی ضرورت اور اہمیت اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے۔

علاوہ بریں اپنی نگارشات اور بے لاگ تحقیق سے وہ اس اہم امر کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ہندوستان میں بہت سے ایسے موضوعات پر فارسی میں عمدہ، معتبر اور محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن پر خود ایران میں ایسی اعلیٰ درجہ کی کتابیں دستیاب نہیں۔ مثلاً تاریخ، فرہنگ نویسی، قواعد زبان، تذکرہ نویسی، اقوال صوفیا (ملفوظات) وغیرہ۔ فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان میں فارسی کے تسلط کی طویل مدت میں فارسی زبان میں متنوع موضوعات پر صدہا کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ بعض اعتبار سے ہندوستانی فارسی ادب ایرانی فارسی ادب سے سبقت لے گیا ہے۔ سبک ہندی جیسا اہم طرز شعر گوئی فارسی کو ہندوستان ہی کی دین ہے۔''[۱۰]

اپنی گفتگو کو اس ذکر پر ختم کرنا چاہتی ہوں جو ان کی دلچسپی توجہ اور تحقیق کا خاص مرکز رہا۔ یعنی مخطوطہ شناسی اور ان کی تصحیح و تدوین وطباعت۔ پروفیسر نذیر صاحب پوری طرح آگاہ تھے کہ ہندوستان میں فارسی زبان کی اہمیت اور اس کی بقا کے ضامن نسخہ ہای خطی کی وہ میراث ہے جس کا امین تاریخ نے ہم کو بنایا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ فارسی زبان ہمارے ملک تاریخ، ثقافت، ادب اور فکر سے متعلق اطلاعات کا ماخذ اور منبع رہی ہے۔ عہد وسطی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا تک کی فارسی تحریروں میں ہندوستانی تاریخ اور فرہنگ کا رکارڈ دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان کو افسوس تھا کہ ایسی بے شمار اور بیشتر اطلاعات ہنوز نسخہ ھای خطی میں مقید و محصور ہیں۔ شاید ہماری نوجوان نسل کو احساس بھی نہ ہو کہ لائبریریوں میں بند ان خاموش تحریروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ قرون وسطی کی جامع تاریخ، آداب معاشرت، میدان کارزار کے نقشے، دربار داری کے لوازم، فرہنگ شعروادب، علوم وفنون، زبان و بیان کے نکتے، حکمت واخلاق، فلسفہ وطب، مصوری وموسیقی، عرفان وتصوف، درویشی وشاہنشاہی، مراسم و

جشن، اطعمہ والبسہ ہیں۔ سیاست مدن، جغرافیہ وریاضی، عروض وقافیہ، ادیان وعقاید، حیوان شناسی وآیورویدا، شکار وتفرج، علم الابدان وعلم البلدان، عادات وافکار، صرف ونحو غرضیکہ انسانی زندگی سے وابستہ ایک ایک اور اس کے چھوٹے اور بڑے ہر پہلو پر بڑی کاوش اور جان فشانی سے لکھی گئیں یہ تحریریں ہماری شناخت ہیں۔ سفرنامے، روزنامچے، انشاء، تذکرے، بیاضیں، کلیات، مناظرے اور مباحثے مکاتبت مراسلت القصہ تحریروں کی کوئی صنف ایسی نہیں جس کو وسیلہ بنا کر دوران ماضیہ کے لکھنے والوں نے آنے والی نسلوں کے لئے اطلاعات نہ چھوڑی ہوں۔ یہ ایک ایسی عظیم اور پرشان وشکوہ میراث ہے، جس کے بغیر ہم اپنے وجود کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں۔ ہماری اس قومی، علمی اور تہذیبی میراث کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لئے نذیر صاحب نے یہ بیڑہ اٹھایا کہ مخطوطہ شناسی اور نسخہ ہای خطی کی تدوین وتصحیح واشاعت کے ذریعہ وہ انسانی تہذیب وتمدن کی ان بیش بہا دستاویزات کو منظر عام پر لائینگے۔ اور انھوں نے اپنی تمام زندگی اس کام کے لئے وقف کردی۔ تاریخ کے تحفظ کا یہ جذبہ، اپنی فرہنگی وعلمی اطلاعات کو مستقبل کے لئے محفوظ رکھنے کی یہ دھن اور لگن شاذ ہی نظر آتی ہے 'ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما'۔

یقین ہے آنے والی نسلیں اس جید عالم کی چھوڑی ہوئی میراث سے فیض یاب ہوتی رہیں گی اور اس کو اپنے لیے مشعل راہ قرار دیں گی۔

....

حوالے:

۱- نذیر احمد دانشمندوں کی نظر میں، علی گڑھ، ص ۲۱۵
۲- کلیات سبک شناسی، سیروش شمیسا، تہران، ص ۱۴۲
۳- غالب پر چند تحقیقی مقالات، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
۴- ایضاً
۵- خدا بخش خطبات، تہذیب زبان ادبیات، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، ص ۲۱۸
۶- ایضاً، ص ۲۰۷
۶- ایضاً، ص ۱۹۵

۷- ایضاً، ص ۱۹۶

۸- ایضاً، ص ۲۱۵

۹- ایضاً، ص ۲۰۶

....

عبدالقادر جعفری

پروفیسر نذیر احمد کا جہان تحقیق وتنقید

پروفیسر نذیر نے نصف صدی سے زیادہ فارسی زبان وادب تحقیق وتنقید کی خدمت کی ہے۔ انہوں نے تنقید کے مختلف رخ ورجحانات بھی دیکھے اور کسی حد تک ان سے متاثر بھی ہوئے لیکن ان کی خصوصیت رہی کہ انہوں نے اعتدال وتوازن کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ اوران کا یہی اعتدال، یہی سادگی، یہی نرم گفتاری اور پرکاری ان کی تمام تحقیقی وتنقیدی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے جوانہیں دوسرے محقق ونقاد سے ممتاز وممیّز بناتا ہے۔ انہوں نے فارسی تحقیق وتنقید کونئی جہت بخشی، نئی تبدیلیوں سے آشنا کیا اور آئندہ نسل کے لیے غور وفکر کی راہیں کھولیں۔ ان کے قلمی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے میدانِ ادب میں تحقیق وتنقید کے علاوہ تاریخ ولغات وغیرہ بھی ان کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ ان کی تحریر کا یہ وصف ہے کہ زبان سیدھی سادی سلیس اور صاف لکھتے ہیں۔ ان کا انداز بیان شائستہ متوازن اور سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ بحث کا طریقہ سنجیدہ اور مدلل ہوتا ہے۔ اخلاق ومتانت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ تحریر میں شائستگی، صداقت اور خلوص ان کی ذات وصفات کے آئینہ دار ہیں۔ موضوع کوئی بھی ہو ان کا انداز ایک ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں خلوص صداقت اور تاثیر کا سرچشمہ ہیں۔ نذیر کے تحقیقی مضامین میں تنوع ہے ان کا تحقیقی سرمایہ مقدار ومعیار دونوں کے اعتبار سے وقیع ہے انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ ان کی سچی

کاوش و مخلصانہ غور و فکر کا آئینہ دار ہے۔ فارسی زبان و ادب کی تحقیق کا معیار جو علامہ قزوینی، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود وغیرہ سے بلند ہوا اسے پروفیسر نذیر نے بلند تر کر دیا۔

تحقیق، تنقید، تدوین اور ترتیب سے نذیر صاحب کو بڑی دلچسپی رہی ہے اور وہ انہیں سے فارسی زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے ان کی نگاہ دوررس ہے۔ تجربہ وسیع ہے وہ تحقیق و تنقید اور تلاش و جستجو کے رموز سے باخبر ہیں۔ تخلیقات کی پرکھ کی صلاحیت قدرت نے انہیں خوب عطا کی ہے اس لیے ناقدانہ بصیرت سے کام لے کر فارسی کے تنقیدی خزانہ میں بیش بہا اضافہ کرتے رہے۔ نذیر صاحب نے فارسی ادب کے کسی خاص موضوع کو اپنی تحقیق و تنقید کے لیے نہیں منتخب کیا بلکہ گوناگوں مسائل اور موضوعات پر یکساں مہارت اور تبحر علم سے قلم اٹھایا یہی ان کی افضلیت کی دلیل ہے۔ اگر کہا جائے کہ ان کی شخصیت محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے تو غالباً مبالغہ نہ ہوگا۔ ہمیشہ آپ نے ایسے مضامین کا انتخاب کیا جو دقیق تحقیق سے متقاضی ہوں اور تاریخ و ادب میں حقیقتاً اضافہ کر سکیں اور آئندہ تحقیق کی نئی راہیں کھول سکیں۔ تاریک گوشوں کو روشن کرنا نئے مآخذ کو روشناس کرانا اور قدیم یا جدید ادبی اور تاریخی روایات و نظریات کے لیے شواہد کی روشنی میں متوازن تنقید کرنا آپ کی تحقیق کے مقاصد رہے ہیں۔ اور یہی حقیقی تحقیق ہے۔ وہ ہمیشہ رسمی موضوعات سے گریزاں اور جہان تازہ کی تلاش و جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ان کا کوئی مخصوص میدان نہیں۔ تحقیق و تدوین و تنقید و فرہنگ شناسی پر مختلف موضوعات پر علمی و ادبی مقالات ان کی شخصیت کا امتیاز ہیں۔ وہ ایسے عالم ہیں جن میں علم و عمل اور نظر و خبر کا اجتماع ہے۔

تقریباً ۵۰۰ سے زیادہ ان کے مقالات ادب، زبان، زبان کی قواعد، زبان شناسی، مخطوطہ شناسی، کتبہ شناسی، تاریخ، فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری، خطاطی، فن تعمیرات وغیرہ پر عالمی شہرت کے حامل ہیں۔ نذیر صاحب کی جولانگاہ فکر و نظر صرف شعر و ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ انہوں نے فارسی میں موجود علوم عقلیہ اور نقلیہ کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ مصوری اور موسیقی کے موضوعات پر بھی جو کچھ تحریر فرمایا اس کو اہل علم کے حلقہ میں درجہ استناد حاصل ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ تہذیب اور تمدن کو سمجھنے کا سب سے اہم وسیلہ زبان ہے۔ جس محقق نے زبان کو اہمیت نہیں دی اس کی تحقیق یقیناً ناقص رہتی ہے۔ نذیر صاحب نے تصنیفات اور مقالات میں زبان کو آلہ کار بنایا ہے۔ مخطوطہ شناسی اور فرہنگ شناسی میں وہ بے نظیر ہیں۔ انہوں

نے بے شمار فارسی مخطوطات اور شخصیات کی بازیافت کی اور متنی تحقیق کو مستقل فن بنایا۔ پروفیسر نذیر نے ملک اور بیرون ملک کی مختلف آرٹ گیلریوں اور لائبریریوں میں مختلف مخطوطات اور تصاویر کی بازیافت کی جن کی تعداد تقریباً سو سے زیادہ ہے جو اسلامی آرٹ اور کلچر میں ایک اہم سرمایہ ہیں۔ نذیر صاحب کی متنی تحقیق کے نمونے مکاتیب سنائی، دیوان حافظ، دیوان عمید لونکی، دیوان سراجی، فرہنگ قواس، دستورالا فاضل، فرہنگ زفان گویا، نقد قاطع برہان، فرہنگ لسان الشعراء، اور اعجاز خسروی وغیرہ ہیں۔ مکاتیب سنائی کی اشاعت ۱۹۶۲ء میں ہوئی اس مجموعہ میں سنائی کے ۷۱ مکتوبات ہیں جنہیں سنائی نے دوستوں، معروف ہمعصروں، بہرام شاہ غزنوی، سلجوقی وزیر ابوالقاسم اور عمر خیام کے علاوہ چند دوسرے اشخاص کو لکھے ہیں ان کے علاوہ بیشتر خطوط زبان و ادب کے اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نے لقب شناسی کے میدان میں قابل تحسین کارنامے انجام دیے۔ ہندستان کی سب سے قدیم فرہنگ فرہنگ قواس کو اپنی تحقیق کا مورد بنایا اور اس کی ترتیب وتصحیح کی۔ اس کے علاوہ فرہنگ زمان گویا کی تالیف بھی ان کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ فرہنگ لسان الشعراء کا تنقیدی اڈیشن بھی شائع کیا لسان الشعراء سے ہی فرہنگ قواس اور زفان گویا کے نقص کی تصحیح ہوسکی۔ ڈاکٹر صاحب نے فارسی فرہنگ نویسی پر جو نادر تحقیق اور مواد فراہم کیا ہے اس سے ان کی علمی فتوحات کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرہنگ پر نقد وتبصرہ اعلیٰ علمی اور فنی کام ہے اس میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ غرضکہ انہوں نے جتنی کتابوں پر تحقیق وتنقید وتدوین کی ہے ان سے متنی تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط مرتب کیے جاسکتے ہیں اور متنی تحقیق کا دشوار گزار مرحلہ بآسانی طے کیا جاسکتا ہے۔

فرہنگ قواس کا ایک مبسوط مقدمہ پیش کیا اور فرہنگ اور صاحب فرہنگ کے بارے میں تفصیلی معلومات دیں۔ بعض محققین سے اختلاف رائے کی حتی کہ کہیں کہیں مصنف سے بھی اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ اور فرہنگ قواس کے تسامحات کی نشاندہی کرتے ہیں، فرہنگ قواس کی تدوین وتصحیح میں تقریباً ۴۰ مقامات پر شعرا کے ناموں کی غلطی دریافت کی۔ دستورالافاضل اور لسان الشعرا کی تدوین بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے ذریعہ بہت سے سیاسی اور ثقافتی اداروں کے متعلق اطلاعات ملتی ہیں۔

اعجاز خسروی کے ترجمے میں جو حواشی نذیر صاحب نے دیے ہیں ان سے ان کے تبحر

علمی کا اندازہ ہوتا ہے اور ان میں ان کی دانشوری، تخلیقی صلاحیت اور قوت متخیلہ کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے جس نے ان کی تحریر کو بصیرت افروز بنا دیا ہے۔

برہان قاطع اور قاطع برہان کے تقابلی مطالعہ کے بعد اپنی رائے پیش کی اور انصاف و توازن کو برقرار رکھا۔ نذیر صاحب نے اگر غالب کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے تو محمد حسین تبریزی کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے، یہی رویہ انہیں دوسرے علما اور فضلاء سے ممتاز کرتا ہے جنہوں نے برہان قاطع اور قاطع برہان پر قلم فرسائی کی ہے، نذیر صاحب نے تعلیقات کے باب میں نہایت اہم امور پر روشنی ڈالی ہے متعدد مانوس اور غریب الفاظ و لغات کے معنی و مطالب کو صراحت و وضاحت سے بیان ہے۔ بہت سے لغات و اصطلاحات کی مثالیں دوسرے شاعروں کے شعری تخلیقات سے تلاش کر کے دی ہیں استدراکات اور اضافات کے سلسلے میں بھی نہایت مفید اور معنی خیز معلومات فراہم کرای ہیں۔

ڈاکٹر صاحب محض لسانی خصوصیات کے ذکر پر اکتفانہیں کرتے بلکہ مضمون کے لب لباب پر ان اسلوبیاتی خصوصیات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جن سے ادیب کے نثری اسلوب کا تعین ہوتا ہے چونکہ وہ الفاظ تراکیب اور لغوی بنیادوں سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے لسانی شناختوں کا مسئلہ ان کی نکتہ آفرینی کا مخصوص دائرہ کار بن جاتا ہے، مختصر یہ کہ نذیر صاحب نے جتنے بھی متون بشمول فرہنگ ہای مختلف کی ترتیب و تدوین کی ہے ان میں عالمانہ انداز اور جس کثرت سے تعلیقات و حواشی کو شامل کیا ہے ان سے اصل متن کی معنویت اور افادیت میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ تنقید Evaluation اور تشریح کا نام ہے۔ تنقید ہی سے تخلیق کی معرفت اور آگہی ہوتی ہے۔ تنقید ہی سے ادب میں رد و قبول کا عمل ہوتا ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو ہوتی ہے۔ فارسی میں تنقید کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے قابوس نامہ چہار مقالہ، اور تذکرے اس کا بین ثبوت ہیں، ادب کی تنقید کرتے وقت اس کے تاریخی پس منظر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کیونکہ ادب کا مطالعہ تاریخی تغیرات کی روشنی ہی میں صحیح اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ شاعر اور ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی تخلیق اپنے عہد کی جملہ خصوصیات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ نذیر احمد ایسے نقاد ہیں جو موضوع اور ہیئت دونوں کی خوبیوں کو ادب کے لیے لازمی قرار

دیتے ہیں۔ تاریخیت ان کی تنقید میں کلیدی رول ادا کرتی ہے اس سے وہ ماضی کی ادبی روایات کا احترام کرنے کا سلیقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہر تاریخیات کی طرح اپنے موضوع کے پیش نظر تاریخ سے اہم اور کارآمد باتیں بروئے کار لاتے ہیں اور بڑے دلائل اور براھین کی روشنی میں اپنی باتوں کو سادہ اور سلیس زبان میں لطافت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ وہی تحریر زندہ رہ سکتی ہے جس میں بڑی سے بڑی بات صاف واضح اور متین انداز میں کہی جائے غالبًا اسی لیے ان کا اسلوب سادگی، سلاست، لطافت اور دلکشی سے پر ہے۔ عہد وسطی کی تاریخ وثقافت سے متعلق ان کے مقالات نہایت اہم ہیں ان میں ایک عظیم مورخ کے معاشرہ میں جو سماجی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا دلچسپ تجزیہ ملتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نذیر صاحب نے شعر وادب سے متعلق رسمی موضوعات کے بجائے علمی، لغوی اور شعری ونثری صنعتوں سے متعلق مسائل کو اپنے لیے مخصوص کرلیا۔ دیوان عمید لوئکی کی تکمیل عمید کا کلام مختلف شعراء کے تذکروں، بیاضوں اور فرہنگوں سے حاصل کیا۔ عمید لوئکی تیرہویں صدی کا دوسرا اہم شاعر ہے جس نے مختلف امراء کی مدح میں قصائد لکھے۔ نذیر صاحب نے بری محنت سے امراء کی شناخت کے سلسلے میں معاصر تاریخوں اور کتبیات سے مدد لی اس لیے ان کی تعلیقات بڑی معلومات افزا ہیں۔ عمید کے کلام سے ان روایات پر روشنی پڑتی ہے جن کے بارے میں معاصر تاریخیں بھی خاموش ہیں۔ آپ کی علمی کاشوں کا تجزیہ وہی کرسکتا ہے جو ایران و ہند کی سیاسی سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور ادبی تاریخ سے بخوبی واقف ہو۔

ہندستان کا رشتہ ایران سے کافی استوار رہا ہے وہاں کی ہزاروں تلمیحات اور استعارے ہماری زندگی کے جزو بن چکے ہیں۔ غالب کے یہاں قدیم ایران ایک اہم موضوع کی حیثیت سے نمایاں ہے اوستا، زند، پازند، دساتیر وغیرہ کے ذکر سے غالب کی تحریریں پُر ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو قدیم ایران کی تاریخ سے دلچسپی تھی لیکن غالب سے جذباتی لگاؤ کے باوجود ہم اس تاریخ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جس سے کلام غالب اور ان کی تحریروں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ نذیر صاحب نے غالب کی قصیدہ گوئی کا تجزیہ کرتے وقت اس طرف خاص توجہ دی ہے۔ غرض کہ ان کے ترتیب دیے ہوئے متن اصلاً علم کا خزانہ ہیں۔ حافظیات اور غالبیات پر جو کام نذیر صاحب نے کیے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ انہوں نے غالب کی دساتیر پسندی

پر جو رائے قائم کی ہے اس سے ان کی تاریخ دانی، سخن شناسی اور ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے اور غالب پر کام کرنے والوں کے لیے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ قاطع برہان پر جو کچھ نذیر احمد نے لکھا ہے اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ غالب کے کلام کے تجزیے کے ساتھ انہوں نے شاعری کے بنیادی عناصر پر بھی گفتگو کی ہے۔ شعری لوازمات کیا ہیں تخیل اور محاکات دونوں کی شاعری میں کیا کارکردگی ہوتی ہے اس پر سیر حاصل گفتگو کر کے فارسی کو ایک نیا وژن دیا ہے۔ نذیر صاحب کا ہر مقالہ شاعر اور مصنف کی خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے اور اس کی گہرائی، گیرائی اور وسعت کو واضح کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے علمی، تحقیقی اور تنقیدی جدوجہد کا یہی مقصد ہے۔

چونکہ تنقید بھی ادب کی ہی ایک صنف ہے اور ناقد کے ذاتی ذوق اور جذبات سے الگ نہیں کی جاسکتی لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر صاحب کی تنقید مشرقی مزاج کی ہے ان میں نکتہ سنجی ذہانت اور شگفتگی ملتی ہے ان کے تنقیدی مضامین ان کی تنقیدی بصیرت کے مظہر ہیں۔ انہوں نے تجسس کو بیدار کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے اور قصر تحقیق کی تعمیر کے لیے محکم واستوار بنیاد قائم کی۔ بلاشبہ نذیر صاحب نے فکر کو بدلا، نیا زاویہ دیا جدید ادبی رویے کے لیے راہ ہموار کی اور جدید فارسی تنقید کی عمارت کو محکم و مضبوط بنایا۔ نذیر احمد ایسے نقادوں میں ہیں جو تہذیبی اثرات کی اہمیت کے پاسدار ہیں۔ وہ شعر وادب میں حسن کے قائل ہیں انہوں نے انداز بیان اور لفظی محاسن پر بھی نظر رکھی ہے۔ انہیں تنقید کے مختلف رجحانات سے بھی واقفیت ہے اور انہوں نے مغربی تنقید سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ادبی تاریخ نگاری میں شعراء اور ادبا کو کشادہ نظری سے پرکھا اور ان کے داخلی اور فنی محاسن کو اجاگر کیا۔ جدید فارسی تنقید نذیر احمد کی مرہون منت ہے کہ اس میں انہوں نے نئی روح پھونکی جس سے تنقید محض جانبداری، خودستائی اور مرعوبیت کا اظہار نہ ہو کر سائنٹفک اور حقیقت نگاری کی راہ پر گامزن ہوئی، نذیر احمد ایک عقلیت پسند اور حقیقت پسند ادیب محقق اور ناقد ہیں انہوں نے اپنے تنقیدی رویے سے فارسی تنقید کو توازن عطا کیا۔ نذیر احمد کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے موضوع کی اہمیت کے ساتھ اسلوب کو بھی اہم قرار دیا، کیونکہ ادب کا جمالیاتی پہلو اچھی بات کو اچھے الفاظ میں کہنا ہے۔ پروفیسر نذیر کا مرتبہ بہ حیثیت محقق اور نقاد مستحکم منزل کا حامل ہے وہ متوازن رویے کے ساتھ فکر و نظر کے محقق و نقاد ہیں جن میں وقار بھی ہے اور سربلندی بھی۔ ان کے تنقیدی مزاج میں متانت اور میانہ روی ہے اور وہ ادب کو خوبصورت وضاحتی انداز میں پیش کرتے

ہیں جس سے ان کی فکری اور فنی انفرادیت واضح ہوتی ہے ان کے مقالات کا انداز بیان تجرباتی اور مدلل ہوتا ہے اس لیے ایہام کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور بیشتر نکات خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔ نذیر صاحب نقد و تبصرہ کے ذریعہ اپنی تحقیق کو متوازن اور معتدل بناتے ہیں جس سے بامقصد اور مثبت تحقیق تک رسائی ہوتی ہے۔ ان کی تحقیق و تنقید سے صرف فارسی زبان و ادب کا دامن ہی وسیع نہیں ہوا بلکہ متنی تحقیق جو آپ کا طرۂ امتیاز ہے کہ اصول و قوانین بھی مرتب ہوئے ہیں۔ فارسی ادب کا کوئی محقق آپ کی تحقیقات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ بقول پروفیسر شریف حسین قاسمی آپ کے مختلف النوع علمی کارناموں کی روشنی میں تحقیق تنقید و تدوین متن، نسخہ شناسی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی ادبی و تہذیبی اہمیت، علمی و تحقیقی انداز پر سوانح نگاری اور استخراج وغیرہ کے قابل قبول اصول مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ تمام عملی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے انفرادی طور پر ذوق ادب کی تکمیل میں جس دلسوزی اور عرق ریزی سے پروفیسر نذیر نے کام کیا ہمیں اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اس موقع پر ایک اہم واقعہ قابل غور ہے کہ مولانا شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''شعر العجم'' کی اشاعت سے پہلے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران شائع ہو چکی تھی ''شعر العجم'' آنے پر محمود شیرانی نے براؤن کے مقابلہ میں ''شعر العجم'' کو غیر معتبر قرار دیا تو سر شیخ عبدالقادر نے لکھا ''مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک مشہور یورپین عالم نے مولوی شبلی کی کتاب کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا کہ ہندستان میں بیٹھ کر ایک شخص اتنی پر از معلومات کتاب لکھ سکتا ہے جب کہ اسے وہ تمام سہولتیں میسر نہیں جو یوروپ میں ہیں کم و بیش یہ مقولہ پروفیسر نذیر پر بھی صادق آتا ہے کہ ہندستان میں فارسی جب روبہ زوال ہے اس وقت انہوں نے اس قدر مفید اور بارور تحقیق و تنقید کے در وا کیے۔

نابغۂ روزگار، قزوینیِ ہند پروفیسر نذیر احمد:
فارسی فرہنگوں کی نقد وصحت کے حوالے سے

پروفیسر نذیر احمد فارسی دنیائے ادب کے وہ درخشندہ ستارہ ہیں جن کو فارسی دنیا کے لوگ ان کی تحریروں کے ذریعہ مدتوں یاد رکھیں گے، انہوں نے فارسی، اردو، انگریزی زبانوں کے حوالے سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جس نے ہماری تینوں زبانوں کے ادب کو غنی کیا۔ فرہنگوں پر ان کی دقیق نظر نے ہم کو نئی نئی راہیں دکھائیں، تصحیح وتحقیق وتدوین ان کا محبوب مشغلہ تھا انہوں نے ایسے اہم اور گاہے منحصر بہ فرد خطی نسخوں کو روشناس کرایا جن سے لوگ آشنا بھی نہ تھے، انہوں نے اپنے بعض مقالوں میں اردو مسائل سے بھی بحث کی ہے، معمار تاج محل، فن معماری، اسلامک آرٹ وکلچر اور حتی کہ اسلامک ادویات پر بھی ان کی نظر تھی، ان عنوانات سے متعلق بھی انہوں نے وقیع مقالے لکھے اور ہم کو حیرت میں ڈال دیا۔

لغت نویسی اور تصحیح وتنقید اور تحقیق لغت، فارسی کی تمام فنون میں ایک اہم اور مشکل ترین فن تسلیم کی جاتی ہے۔ پروفیسر نذیر صاحب کی فارسی فرہنگ نویسی کے مسائل پر گہری نظر تھی، وہ اس کی تصحیح کے وقت ان مسائل کو سامنے رکھکر اس کا انتقادی متن اس انداز سے تیار کرتے کہ کسی

اشتباہ کے سرزد ہونے کی گنجایش نا ہونے کے برابر رہ جاتی تھی۔انہوں نے اس میدان میں وہ نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں کہ مدتوں اُن کی اِس صلاحیت کی داد دی جاتی رہے گی۔اس فن سے متعلق جن فرہنگوں کی تصحیح وتنقید کر کے عالی مرتبت انتقادی متن تیار کیا ہے وہ ہیں:

فرہنگ قواس: یہ فرہنگ علاء الدین خلجی کے زمانے (۷۱۶-۶۹۵ھ) میں ۶۹۵ء سے پہلے معرض وجود میں آئی، ایران میں اس سے پہلے دو تین فرہنگیں موجود تھیں لیکن ہندستان میں اس سے پہلے کی کوئی دوسری فرہنگ اب تک بھی دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ یہ پہلی کشف شدہ فرہنگ ہے جس کا اس وقت تک منحصر بہ فرد نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں موجود تھا لیکن ناقص، چونکہ بعد کی فرہنگوں میں اس سے خاصا استفادہ ہوا ہے اس لیے نذیر صاحب نے اس کی اولیت واہمیت کا اندازہ کر لیا تھا اسی لیے انہوں نے اس ناقص نسخہ کی تصحیح کا بیڑہ اٹھایا اور اس کے بعد کی ان فرہنگوں جس میں اس کے مندرجات عیناً درج تھے یا اس کے کچھ حصے نقل کیے گئے تھے نیز دوسری فرہنگوں اور کتابوں کی مدد سے ایک نہایت وقیع انتقادی متن تیار کیا۔مصحح نے شعرا کے دیوانوں اور فرہنگوں میں درج وہ اعار جو شواہد کے طور پر آئے تھے ان کو مقابلہ کر کے تصحیح کی اور اس میں موجود ہر وہ اشعار جو اس سے متعلق تھا دور کرنے کی بھی کوشش کی۔

نذیر صاحب نے اس فرہنگ کے دو مقدمے ایک انگریزی اور دوسرا فارسی میں اضافہ کیا جس میں مؤلف کے حالات، انتساب فرہنگ، مندرجات فرہنگ، منابع و مآخذ فرہنگ، پھر لغت فرس سے استفادہ کے بارے میں کچھ نکات، فرہنگ نامہ کے خصایص ونقایص، سبک و زبان فرہنگِ قواس اور آخر میں دستنویس فرہنگ اور اس کی غلطیاں، عبارتوں کا تقدم و تاخر، عبارتوں کی تکرار، تجدید نظر واضافے، زفان گویا اور موید الفضلا میں منقول فرہنگ قواس کے مندرجات اور آخر میں متن قواس پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔فرہنگ قواس موضوع کے اعتبار سے مرتب ہوئی ہے اور موضوعات سے متعلق الفاظ ایک جگہ جمع کیے ہیں جیسے معماری، لباس، پرندگان، خزندگان وغیرہ اور قاری کو اپنے مطلب کا لفظ اس صورت میں ڈھونڈھنے میں بڑی پریشانی ہوتی تھی جبکہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اس لفظ کا تعلق کس بخش سے ہے تو اس لفظ کو ڈھونڈھنے کے لیے اس کو پورا نسخہ کھنگالنا پڑتا تھا، نذیر صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس کی تصحیح وتنقید کی بلکہ اس کی اس

مشکل کے پیش نظر تمام الفاظ کو الفبایی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کر کے ایک فہرست شامل کی جو اس فرہنگ سے استفادہ کرنے والے کو اس کے مقصد تک پہنچنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔اس کی تصحیح کی غالباً یہ خاصی بڑی خوبی شمار کی جاسکتی ہے۔اسی طرح انہوں نے فہرست نام اشخاص و کتاب کی ترتیب کا بھی خیال رکھا۔کبھی ناخوانا الفاظ کو فرہنگوں وغیرہ کے توسط نیز قیاس سے پُر کیا اور کبھی اگر ان کو پڑھا نہ جاسکا تو اسی طرح چھوڑ دیا لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوا۔

اس فرہنگ کے خطی نسخے میں ایک ہی سطر میں لفظ، اس کے معنی اور حتی شہادت کے لیے شعر بھی بغیر کسی فاصلے کے لکھ دیے گئے تھے جس سے اس بات کی تشخیص مشکل تھی کہ لفظ کون سا ہے اور معنی کون سے اور شعر شاہد کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہو جاتا ہے۔اس طرح کی مشکل کتاب کی تصحیح و تنقید کر کے انتقادی و علمی متن تیار کرنا مشکل کام تھا لیکن مصحح نے ان مشکلوں کے باوجود جو ایک ناقدانہ متن تیار کیا وہ ان کے علمی تنقید و تصحیح کے تبحر پر دال ہے۔

اگر یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ابیات کے نقل کرنے میں مؤلف سے غلطی سرزد ہوئی نہ کہ کاتب سے تو نذیر صاحب نے اس کو متن میں اسی طرح چھوڑ دیا اور اس کی صحیح صورت کو حاشیہ میں درج کر دیا کیونکہ مصحح کا مطمح نظر یہ تھا کہ علمی و انتقادی متن سے مراد وہ متن ہے جو خود مؤلف نے لکھا ہے نہ کہ کسی اور نے، پڑھنے والے کی مشکل کو زیادہ سے زیادہ حل کرنے کی غرض سے ایک لفظ کے جو اور دوسرے معنی دوسری فرہنگوں میں درج تھے ان کا اندراج حاشیہ میں کر دیا اور جس کتاب سے استفادہ کیا اس کا نام اختصار کے ساتھ اور صفحہ نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ اگر شاعر کا نام بیت کے ذیل میں متن میں نہیں آیا اس کو حاشیہ میں لکھ دیا اور اگر شاعر کا نام متن میں غلط ہے تو متن کو اسی طرح چھوڑ کر حاشیہ میں صحیح نام درج کیا ہے۔یہ کتاب ۱۳۵۳ش ر۱۹۷۴ء میں احسان یار شاطر کی مدد سے بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران، ایران سے شایع ہوئی۔۱۹۹۲ء میں کراچی میوزیم پاکستان میں ایک مجموعہ دستیاب ہوا جس کو نذیر صاحب نے منگایا، اس کے عمیق مطالعے کے بعد اس میں موجود پانچ کتابوں کا انکشاف کیا۔اس میں فرہنگ قواس کا بھی مکمل نسخہ تھا لیکن نہ تو اس میں الگ الگ کتابوں کے نام تھے نہ ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ہی نسخہ نہیں ہے، نہ کسی مؤلف کا ذکر تھا، نذیر صاحب کی عمیق نظری، کثرت مطالعہ اور یادداشت کا کمال تھا جس نے فارسی

دنیا پر ان پانچ کتابوں کو منکشف کیا جن میں قواس، لسان، زفان گویا، ترجمۂ امرت کھنڈ، فرہنگ مختصری جس پر کام نہ کیا جا سکا۔ چونکہ فرہنگ قواس کا یہ نسخہ مکمل تھا اس لیے پہلے چاپی نامکمل کتاب کے نقایص کی تصحیح اس کی مدد سے کی اور بیشتر قیاسی تصحیح جو کہ درست تھیں اس نے خود ان کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس طرح ایک دوسرا ناقدانہ مکمل نسخہ تیار کیا جو ۱۹۹۹ میں کتابخانہ رضا، رامپور سے شایع ہوا۔ اس میں مصحح نے چاپ اول کا مقدمہ نیز مقدمہ ثانی و خواص املا کی بحث کو بھی شامل کیا۔ دونوں نسخوں کا مقابلہ و مقایسہ کر کے چاپ اول میں جو شعرِ شاہد کسی وجہ سے رہ گئے تھے دوسرے نسخے کی مدد سے اس کا اضافہ کیا۔ ممدوحِ مؤلف کے بارے میں کچھ مزید اطلاعات متن سے نکالیں اور مقدمے میں درج کیں۔

اگر اس کتاب کو باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ زیادہ تر قیاسی تصحیح اپنی درست حالت میں ہیں، یہ ناقد کی بہت بڑی اور اہم خوبی ہے۔

دستور الافاضل: سلطان محمد تغلق کے عہد (۷۲۵-۷۵۲ھ) میں حاجب خیرات دہلوی نے ۷۴۳ھ میں مکمل کی جو نذیر صاحب کی تصحیح و نقد کے بعد ایرانی دانشور پرویز ناتل خانلری صاحب کی نگرانی میں ۱۳۵۲ش / ۱۹۷۳ء میں بنیاد فرہنگ ایران سے شایع ہوئی۔ فرہنگ قواس اور دستور دونوں کا ایران سے دانشوران ادبیات ایران کے توسط سے شایع ہونا ہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نذیر صاحب کی ان دونوں تخلیقات اور خود محقق و مصحح کا لوہا نہ صرف ہندوستان بلکہ ایرانی دانشور و محقق بھی تسلیم کرتے تھے اور کرتے ہیں۔

دستور الافاضل کے مؤلف کی زندگی کے حالات اور تألیفات کے بارے میں کسی اور مآخذ سے اطلاع نہیں ملتی ہے۔ نذیر صاحب نے فرہنگ کے مطالعہ کے بعد جو فارسی میں مقدمہ لکھا اس میں اس فرہنگ میں موجود مؤلف کے بارے میں جستہ جستہ حالات و واقعات سے مطلع کیا ہے۔ حاجب کے ممدوح شمس الدین محمد نے فرہنگ قواس کو بہت مختصر کہہ کر حاجب سے لغت لکھنے کی فرمایش کی جس کے مقدمے میں مؤلف نے اپنے اشعار بھی نقل کیے۔ نذیر صاحب کے قول کے مطابق یہ خود نہایت مختصر ترین لغت ہے، اس میں لفظ کے معنی قواس سے زیادہ مختصر انداز میں بیان ہوئے ہیں، شعری یا نثری شواہد بھی نہیں ہیں اور الفاظ کے تلفظ کی طرف بھی توجہ نہیں کی گئی ہے، حاجب نے قواس کو اپنا مآخذ بنایا اور بعض مندرجات کو ہو بہو اپنی فرہنگ میں شامل

کرلیا، نذیر صاحب نے ان تمام الفاظ کی نشاندہی کردی ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ الفاظ اور اشتباہات جو بعد میں لکھی جانے والی فرہنگوں میں داخل ہو گئے ان کو دستور سے استفادہ کے بعد کسی حد تک دور کیا جاسکتا ہے۔

نذیر صاحب کی دوررس نظر نے پہچان لیا تھا کہ دستور میں جو الفاظ دیے گئے ہیں ان کے معنی فارسی میں ہیں لیکن ان کے مترادف ہندی الفاظ ہیں جو زبان شناسی کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ ان میں بعض الفاظ اپنی قدیمی شکل و تلفظ کے ساتھ اب بھی رائج ہیں اور بعض معدوم ہو چکے ہیں، مصحح نے ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔

مصحح نے دستور کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جیسے اس فرہنگ میں کوئی اصول و ضوابط و قواعد مقرر نہیں ہیں یعنی کس طرح کے الفاظ و لغات کو جگہ دی جانی چاہیے اس کا لحاظ نہیں رکھا۔ مصحح کی نظر میں دستور میں درج بعض الفاظ کے معنی اشتباہ سے خالی نہ تھے جن کو دوسری فرہنگوں اور کتابوں سے صحیح کر کے حاشیہ میں نشاندہی کی ہے، مؤلف دستور بعض الفاظ کبھی صورت اور کبھی معنی کے اعتبار سے غلطی کا مرتکب ہوا ہے جیسے ایک جگہ لفظ سغہ کشیدہ کے معنوں میں اور پھر لفظ سغبہ بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ایک لفظ مصحف ہے۔ نذیر صاحب نے بعض اس طرح کے الفاظ کی تصحیح کردی اور بعض جگہ خود ان کے قول کے مطابق وہ بھی درست نہ کر سکے تو اسی طرح چھوڑ دیا۔ قواس میں بعض الفاظ اگر چہ صحیح تھے لیکن دستور میں اس کو غلط نقل کر لیا گیا جس کی نشاندہی مصحح نے کردی اور اس پر روشنی بھی ڈالی۔ دستور کا ایک ہی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود تھا لیکن اس پر تاریخ درج نہ تھی لیکن نذیر صاحب نے دوسری فرہنگوں کی تعلیقات اور کاغذ کی تاریخ سے واقفیت کی مدد سے اس کا تعلق دسویں صدی ہجری سے سمجھ لیا تھا۔ اگر چہ نسخہ صاف اور پڑھا جا سکنے کے لائق تھا لیکن اس میں کمی و کاستی موجود تھی اور اس وقت تک کوئی دوسرا نسخہ موجود نہ ہونے کے سبب ان تسامحات کو دور نہیں کیا جاسکا تھا لیکن نذیر صاحب نے ان تسامحات کو موید الفضلا کی مدد سے صحیح کرنے کی کوشش کی لیکن مؤلف موید کے مطابق اس نے بہت سے الفاظ اور ان کے معنی کو دستور سے نقل کیا ہے۔ دستور کے مقدمہ میں موجود غلطیوں کو قواس میں موجود مقدمہ سے صحیح کیا۔ جب یہ کتاب چھپنے کے مراحل میں تھی تو ایران سے اس کا ایک نسخہ نظر ثانی کے لیے نذیر صاحب کو بھیجا گیا۔ نذیر صاحب

نے تقریباً ۱۰۲ حاشیہ اور ۶۷ متن کی غلطیاں درست کر کے واپس بھیجا جس میں صفحہ نمبر اور سطر کا حوالہ دیتے ہوئے درست نادرست کی نشاندہی کی۔ بہر حال ہم مصحح کے طریقۂ کار کو پڑھ کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ صحیح نتایج تک پہنچنے میں کس حد تک کامیاب رہتے تھے، ان کا یہ وقت طلب کام نہایت درجہ قابل ستایش ہے۔

زفان گویا و جہان پویا:

۱۹۶۲ء میں پروفیسر سید حسن، پٹنہ یونیورسٹی کا ایک مقالہ فرہنگ زفان گویا و جہان پویا اور ۱۹۶۴ میں بایسفکی نے مقدمۂ زفان گویا کے عنوان سے مقالہ شایع کرایا۔ نذیر صاحب نے دونوں مقالوں کا مطالعہ کیا اور سمجھ لیا کہ یہ دونوں ہی مقالات اشتباہات سے خالی نہیں ہیں، اس طرح ان کو اس فرہنگ کی تصحیح کی تشویق ہوئی۔ انہوں نے اس کے دو نسخے پٹنہ اور تاشقند سے حاصل کیے۔ جس میں پٹنہ والا تقریباً مکمل اور تاشقند والا ناقص، نامکمل اور اشتباہات سے پُر تھا، دونوں نسخوں کا مقایسہ نیز دوسری کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیقی وتنقیدی متن تیار کیا اور جلد اول کے نام سے ۱۹۸۹ میں شایع کرایا، نذیر صاحب نے ہر لفظ کی تصحیح وتوضیح وتشریح نہایت مفصل حاشیہ میں دی ہے۔ یہ اس صنف پر ان کے مکمل عبور کی نشاندہی کرتی ہے۔ انہوں نے اس میں مفصل فارسی اور انگریزی مقدموں کا اضافہ کیا۔

نذیر صاحب کو فارسی، عربی اور اردو گرامر، قافیہ وعروض پر گہری نظر تھی۔ اپنی اس خوبی کی وجہ سے انہوں نے فارسی کی ان لغات جن کا انکشاف وصحت کا کام انجام دیا، کو اس نظریہ سے بھی اور ان کی خامیوں اور خوبیوں کو اپنے مفصل مقدمہ میں بیان کیا اور ان کی شہادت کے لیے وہ الفاظ بھی شامل کیے جن میں وہ خامیاں یا خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کی یہ بڑی خوبی تھی جو ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ چونکہ وہ ترکی نہیں جانتے تھے اس لیے وہ الفاظ جو ترکی ہیں ان کی اس طرح سے تصحیح نہ کر سکے جس طرح سے فارسی الفاظ کی کی گئی ہے۔ جس کے لیے عذر خواہی اور اپنی غیر اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار اصول تحقیق کی رو سے مصحح کی پہلی خاصیت ہوتی ہے، انہوں نے اس کسوٹی پر کھرے اترنے کا جواز پیش کر دیا ہے، ہم ان کی دیانت داری کے دل سے معترف ہیں۔

زفان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ زفان اس سے پہلے کی موجود

فرہنگوں فرس، صحاح، دستور، تو اس سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں ان کی نظر میں قدیم دستیاب شدہ فرہنگوں سے زیادہ فارسی الفاظ اور ان کی توضیحات نیز فارسی، عربی، ترکی، اور رومی الفاظ کو الگ الگ فصلوں میں بیان کیا گیا ہے اور عربی زبان کی گرامر کے اصول جیسے جمع وتنوین وغیرہ بنانے کے قاعدے فقط ان الفاظ کے لیے درست قرار دیے ہیں جو فارسی میں رائج تھے نہ کہ فارسی اصیل الفاظ کے لیے، اس طرح عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کے درمیان تفریق، مفرد الفاظ کو مرکب الفاظ کے ساتھ بنانا، ہندی کے وہ الفاظ جو اس زمانے میں رائج تھے فارسی الفاظ کی وضاحت کے سلسلے میں لغت میں شامل کرنا، اکثر الفاظ کی مختلف صورتوں کا بیان ہونا یہ سب زبان شناسی کے لیے مفید اور لازمی جزو قرار دیئے ہیں۔ انہوں نے یہ بتایا کہ شاید یہ سب سے قدیم فرہنگ ہوگی جس میں وہ الفاظ جو زای عربی و زای فارسی سے شروع یا ختم ہوئے ہوں ان کا اندراج ملتا ہے اور کاف وگاف کے فرق کو بھی بیان کیا ہے۔ ایک بخش جو مصادر سے مختص ہے اس سے الفاظ کے ریشوں کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ شعری شواہد سے احتراز ہے لیکن کبھی کبھی مؤلف کے خود اپنے اشعار درج ہیں جن کو نذیر صاحب نے معیار کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے سست اور بے مزہ قرار دیا ہے۔

اپنے مقدموں میں نذیر صاحب نے اپنے روال کار نیز فرہنگ کی خوبیوں وخامیوں کی فہرست بھی دی ہے۔ تصحیح میں مصحح نے کوشش کی ہے کہ اگر عبارت میں کوئی لفظ رہ گیا یا جان بوجھ کر غلط لکھا گیا اس کو دوسری فرہنگوں کی مدد سے پورا کیا۔ وہ مطالب جو زفان میں دوسری فرہنگوں سے نقل ہوئے یا دوسری بعد کی فرہنگوں میں نقل ہوئے ان کا مقابلہ اصل سے کر لیا۔ اگر کچھ کمی بیشی ہوئی اس کو حاشیہ میں درج کر دیا۔ عربی الفاظ کی تصحیح کے لیے عربی فرہنگوں سے استفادہ کیا، بعض غلط لفظ جو مؤلف نے اشتباہاً لکھے اس کو متن میں برقرار رکھ کر حاشیہ میں نشاندہی کر کے صحیح لفظ کو رقم کیا۔ بعض جگہ الفاظ کسی وجہ سے ناخواندہ رہ گئے ان کو قیاس سے ہی درست کرنے کی کوشش کی۔ ہندی الفاظ کی تصحیح دوسری ہندستانی کتابوں کی مدد سے کی۔ بعض الفاظ کی وضاحت کے ذیل میں صرف لفظ ''معروف'' لکھا تھا جس سے پڑھنے والا شبہ میں پڑسکتا تھا کہ غالباً معروف اس لفظ کے معنی ہوں گے اس لیے نذیر صاحب نے اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے وہاں معروف کے ساتھ است کا اضافہ کیا ہے۔ نذیر صاحب نے اس فرہنگ کی تصحیح ونقد کر کے جو انتقادی متن تیار

کیا ہے وہ ان کے کثرت مطالعہ، محنت، لگن اور فن پر عبور کی دلالت کرتی ہے۔

فرہنگ لسان الشعرا:

یہ فرہنگ فیروز شاہ تغلق کے عہد (۷۵۳۔۷۹۰ھ) کے درمیان لکھی گئی، صحیح تاریخ و تالیف کا اب تک پتا نہ چل سکا ہے۔اسی طرح یہ مؤلف نے متن میں محض ایک قصیدہ میں عاشق لکھا ہے جس سے نذیر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کسی عاشق نامی شخص کی تالیف ہے۔مصحح نے اس کے دو نسخے مجموعہ کراچی میں موجود اور فلورنس اٹلی میں موجود..... دریافت کیے، اس طرح انہوں نے دستیاب شدہ نسخوں نیز دوسری کتابوں کی مدد سے ایک مفصل پیشگفتار فارسی، اور انگریزی میں ایک Preface (دیباچہ) کا اضافہ کیا جس میں داخلی شواہد سے یہ ثابت کیا کہ اس فرہنگ کے لکھنے کی ضرورت فرہنگ اسدی اور فرہنگ قواس کے بعض نقایص کو دور کرنے کی وجہ سے پیش آئی، جیسے خود مؤلف کے قول کے مطابق اسدی میں ابواب ہیں لیکن فصل نہیں ہے، قواس میں نہ باب ہے اور نہ فصل لیکن لسان میں دونوں موجود ہیں۔لسان میں الفاظ کے ہم وزن لفظ بھی لائے گئے ہیں جس کے لیے مؤلف نے بہت محنت کی ہے، نذیر صاحب نے جس کی نشاندہی اپنے مقدمہ میں کی ہے اور ان کا مقابلہ دوسری موجود لغات سے کیا ہے، چونکہ قواس ہندستان میں لکھی گئی اس لیے وہ ہندی الفاظ وفقرات جو یہاں رائج تھے اُس میں ملتے ہیں۔ ہندستان کے بعض قصبات کے نام بھی لفظ کے معنی میں درج ہیں جس سے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، ہندی رسم ورواج کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں اور مؤلف اور لسان نے ان کو اپنے یہاں درج کیا، مصحح نے ان سب کی نشاندہی حاشیہ میں کی ہے۔

لسان میں جو ایسے الفاظ بھی موجود ہیں جن کو پڑھا نہ جا سکا تو ویسے ہی لکھ دیا گیا جیسے یا فربہ معنی بازی گر لیکن مصحح فرہنگ نے اس کی کھوج کی اور نشاندہی کی کہ یہ یاری گر کی تصحیف خوانی ہے۔اگر شہروں کا نام متن میں آیا ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ شہر کہاں واقع ہے، تاریخی ہے یا غیر تاریخی اور خاص شہر سے کتنے فاصلے پر واقع ہے۔متن میں موجود ابیات کا استخراج دیوانوں سے کیا اور گاہے شاعر کا نام بھی تلاش کیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں مصحح نے الفبائی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے الفاظ کی فہرست تیار کی ہے جس کی مدد سے لفظ کی بازیافت میں آسانی ہو سکے۔

نقد قاطع برہان:

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے غالب کی جو مشہور تصنیف قاطع برہان محمد حسین خلف تبریزی تالیف ۱۰۶۲ھ کی رد میں معرض وجود میں آئی تھی، کے بعض مندرجات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے یہ انتقادی متن فارسی کی متعدد قدیم وجدید فرہنگوں کی مدد سے تیار کیا گیا جن میں پہلی بار اختلاف آرا مسائل پر رشنی ڈالی گئی ہے۔نذیر صاحب کے خیال سے برہان قاطع برہان اور دوسری فرہنگوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ برہان پر مرزا غالب کے اکثر اعتراض درست نہیں۔ چونکہ غالب اور صاحب برہان دونوں ہی دساتیر کے جعل سے واقف نہ تھے اور غالباً دونوں ہی اس جعلی کتاب کے مندرجات و زبان دونوں کی افادیت کے قایل تھے، اسی طرح مؤلف برہان اور غالب دونوں ہی ہزوارش کی اصل سے واقف نہ تھے جس میں املا پہلوی رسم خط میں آرامی زبان کی ایک شاخ سامی کا لفظ لکھ لیا جاتا اور اس کا متبادل پہلوی لفظ پڑھا جاتا جیسے پہلوی رسم خط میں مَلکان مَلِک لکھتے ہیں اور شہنشاہ پڑھتے ہیں۔اخ لکھتے اور برات پڑھتے یعنی ان کو صحیح قاعدہ کے بجائے پہلوی املا کے اعتبار سے پڑھا گیا جس سے لفظ کی بالکل اجنبی شکل سامنے آئی۔اس کا اصطلاحی نام ہزوارش ہے اور دونوں ہی اس جعل کا شکار۔

نقد قاطع برہان مرزا غالب کی ان کوتاہیوں پر مبنی ہے جو ان کے برہان پر انتقاد کے سلسلے میں سرزد ہوئیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غالب کے زمانے تک فارسی کے اکثر متون و فرہنگیں منتشر نہ ہوسکی تھیں اور ان کو اس کتاب کی تکمیل کے لیے ان فرہنگوں سے استفادہ کا موقع فراہم نہ ہوسکا تھا جبکہ اس کے برعکس آج حالات دوسرے ہیں۔اگرچہ غالب نہایت ذہین تھے لیکن اس کتاب کے سلسلے میں ان سے خاصی چوک ہوگئی تھی۔

قاطع برہان غالب کی ترتیب میں پہلے برہان سے لفظ لیا گیا، پھر برہان قاطع میں اس لفظ سے متعلق جو تشریح ہے اس کا خلاصہ، پھر غالب کے اعتراض اور آخر میں اس کا محاکمہ، نذیر صاحب نے پہلے لفظ اس کی تشریح وتوضیح، غالب کے اعتراض ومحاکمہ کے بعد اس لفظ کے سلسلے میں دوسری موجود لغات میں موجود توضیحات پر گہری نظر ڈالی ہے اور اکثر میں غالب کو غیر جانبدارانہ ثابت کیا ہے۔انہوں نے مختلف اہم فرہنگوں اور کتابوں کی مدد سے غالب کی کتاب

قاطع برہان کی رد میں نقد قاطع برہان لکھی جس کے پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میدان میں غالباً غالب کا مطالعہ اتنا وسیع اور جامع نہ تھا جس سے وہ اس فن کے ساتھ انصاف کر سکتے، ایرانی دانشوروں کے نزدیک بھی دساتیری الفاظ کی جگہ فارسی اصیل لفظوں کے ساتھ نہیں ہے اور جو لوگ دساتیر کو فصیح لفظ سمجھتے ہیں وہ فارسی کے صحیح خدمت گزار نہیں۔ نذیر صاحب نے غالب کے اس جعل میں پھنسنے پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں تقریباً ۲۰۰ الفاظ شامل ہیں جن کو برہان قاطع سے نقل کیا گیا اور غالب کے اعتراضات پر فرہنگوں کی مدد سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں تمام الفاظ کی الفبائی اعتبار سے ترتیب دے کر درج کر دیا ہے پھر اشخاص کی فہرست اور سے آخر میں کتابوں کی فہرست ہے، یہ وہ نکات ہیں جو تحقیق، تصحیح و تنقید متن کے لیے بہت ضروری ہیں اور نذیر صاحب کی اس کتاب کو پڑھ کر ان کی تنقیدی صلاحیتوں پر داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں نہایت محنت، کاوش اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔

نذیر صاحب نے نہ صرف یہ کہ فرہنگوں کی تصحیح کی بلکہ انہوں نے اردو، فارسی زبان میں ان سے متعلق وقیع مقالے بھی لکھے جو ہندستان اور خارج از ھند کے معروف و مؤقر رسایل میں شایع ہوئے، جس سے ان مقالوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ان فرہنگوں کو عوام سے روشناس کرایا جائے جو اس وقت تک پردۂ خفا میں تھے۔

راقمہ کو شخصاً یہ اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ فرہنگوں کی تصحیح اور انتشار جان جوکھم کا کام ہے جس کو نذیر صاحب نہایت دلجمعی، شوق و لگن اور آسانی کے ساتھ انجام دیتے تھے، ان کی تصحیح کردہ فرہنگوں اور مقالوں کو پڑھنے کے بعد ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دیانت دار، عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور، عروض پر تبحر کامل، علم تخریج پر پوری گرفت، نقد و تنقید میں مہارت، بہترین مقدمہ و حاشیہ نویس، ذہین، مطالعہ کے دلدادہ، نسخہ شناس، (کذا) + تاریخ کاغذ سے آشنا، غرض یہ کہ فرہنگ کے سلسلے کے تمام مسایل سے پوری طرح باخبر تھے، یہ تھی وہ باہوش، زیرک، عظیم المرتبت، قطب زبان فارسی شبہ قارہ، نابغۂ روزگار، ناقد و مصحح شخصیت۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ اس دور میں تو ان کے پایہ کا عالم پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہے اس لیے ان کو قزوینی ہند کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کی تصحیح کردہ لغات جو انہوں نے یادگار چھوڑی ہیں وہ

اپنے آپ میں بے مثال ہیں جس سے ان کی علمی و ادبی پژوھش، مطالعات اور کنجکاوی کا پتا چلتا ہے اور بے ساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

ای کاش نسل نو کو یہ نسخہ بتائیں ہم
حاصل کسی بھی شکل میں تعلیم کیجئے
یہ تین الفاظ ہیں جو خزانہ ہیں زیست کا
کاغذ، قلم، دوات کی تعظیم کیجئے

(پروفیسر نذیر احمد کی نذر)

مغربی ممالک کے کتبخانوں میں امیر خسرو کے نادر قلمی نسخے◆

چندر شیکھر*

حضرت امیرخسرو دهلوی معروف به بلخی کے علمی، اجتماعی، ثقافتی، سیاسی و تصوّف سے متعلّقه کارناموں کا ذکر ان کے اپنے دورۂ حیات سے لےکر آج تک مختلف ذرایع ابلاغ سے دنیا بھر میں اشاعت‌پذیر و مقبول رہا ہے. آپ کے علمی کارناموں کی تعداد مسلسل مورد بحث و مباحثه رہی ہے. جامی نے اپنی مشہور و معروف تصنیف نفحات‌الانس1میں خسرو کی عظمت کا ذکر کرتےہوئے ۹۹، تذکرۂ هفت اقلیم2 کے مصنّف امین‌الدّین رازی کے بقول ۱۹۹ اور تاریخِ‌فیروزشاهی3 مولفه ضیاءالدّین برنی نے تو ایک کتبخانه ہی کہہ‌دیاہے. دولتشاہ سمرقندی نے خسرو کے ابیات کی تعداد پانچ لاکھ درج کی ہے جس کی تأیید تاریخِ‌فرشته کے مصنّف نے بھی فرمانی ہے. اس تعداد پر اپنی رائے کا اظہارکرتے ہوئے شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ قدیم زمانه میں بیت سے مراد مصرعه سے ہوتاتھا[1].

◆ اوّلین سفر یورپ ۲۲-۰۶ فروری ۲۰۱۴. کا ماحاصل.

* صدرِ شعبهٔ فارسی دهلی یونیورسٹی، دهلی.

1. شعرالعجم، ج ۲، ص۱۲۳.

گذشتہ صدی میں، ۱۹۱۴ء میں، نوّاب اسحق صاحب نے سعی بلیغ کے تحت خسرو کے کارناموں کی فہرست و تصحیح و ترتیب کا بیڑہ اٹھایا اور کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے اپنی اس کوشش و کاوش اور تحقیق کے بعد اپنے رسالہ «ترتیب کلیات امیرخسرو» میں تصانیف کی کل تعداد ۴۵ بتائی ہے، مگر ان میں بھی بعض ایسی ہیں جو ایک ہی کتاب کا حصّہ تھی چونکہ ان کے قلمی نسخے منفرد طور پر تیار ہونے لہذا ان کو سہو ا ایک مستقل کتاب سمجھکر اپنی فہرست میں درج کردیا۔ اس کے بعد امیرخسرو کے احوال اور علمی کارناموں پر تجزیہ و تحلیل دوسرا اہم کام وحید میرزا کا ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر ممتاز حسین، ڈاکٹرنذیر احمد، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر ظ.انصاری اور ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے بھی اس ضمن میں نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ لیکن مرحوم نوّاب صاحب نے نہ صرف فہرست ترتیب دی بلکہ اس دور کے معروف اساتذہ کی سعی بلیغ سے خمسہ اور خسرو کی کچھ مثنویاں بعد از ترتیب و تصحیح شایع کروایا جس کی بدولت فارسی زبان و ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

انگریز ی حکومت میں بھی مختلف قسم کے نمایاں ادبی کارنامے انجام دیے گئے۔ اگربعض علوم کا تبادلہ و ابلاغ [Transmission of Knowledge]مغرب سے مشرق میں ہوا تو کچھ کا مشرق سے مغرب

میں بھی ہوا۔ اس امر کی سند، مغربی ممالک کے کتبخانوں میں موجود مشرقی ادب و علوم کی کتابیں ہیں ۔

گذشتہ چند برسوں میں راقم‌السطور کو مختلف ممالک کے علمی سفر کا موقع نصیب‌ہوا، جس کا سبب فارسی زبان ھے۔ بھرحال پروفیسر عابدی صاحب مرحوم کے حسب‌الحکم کوشش رہی کہ ان ممالک کے کتبخانوں کی زیارت ضرور کی جائے۔ اسی سلسلہ میں ترکی، انگلینڈ اور یورپ کے چند کتبخانوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور ان کتبخانوں میں محفوظ امیرخسرو کے قلمی نسخے کی زیارت سے سعادتمند ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے بیشتر کی یہاں مندرج تفصیل محض شایع شدہ کیٹلاگ سے اخذ اطلاعات پر مبنی نہیں بلکہ چشم‌دیدہ بلکہ بقول اھل ایران کے چشمم نورانی و روشن شد۔ ان میں سے کچھ بہت اھم اور ایسے ہیں کہ جن کا علم ھم ہندوستانی کم‌فہم محققین کو نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ امیرخسرو کےکلام کے نسخے مختلف عناوین سےکتبخانوں میں موجودہیں۔

دیوان امیرخسرو اس عنوان کےتحت اکثر نسخوں میں ان کے پانچوں دیوان، انتخاب یابعض میں صرف چند دیوان موجودہیں۔ اس عنوان کے تحت ۲۵ نسخوں کی تفصیل راقم‌الحروف کے ام.فل کے مقالہ[1] میں درج ہے۔ مختلف فہارس کے مطالعہ پر مبنی اطلاعات کے

1. A Bibliography of Amir Khusrau, M.Phil Dissertation, Department of Persian, University of Delhi, Delhi, 1981 (unpublished).

مطابق اس عنوان کے تحت سب سے پرانا نسخہ خراج اوغلو، استانبول کی لائبریری میں نسخہ نمبر ۹۷۸ تحت موجود ہے۔ اس میں پانچوں دیوان ہیں۔ اسے حاجی محمد اسرار نے ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء میں استنساخ کیا تھا[1]۔
کلیات امیرخسرو کے عنوان سے بھی مختلف کتابوں پر مبنی نسخے ملتے ہیں۔ غالبا اس عنوان کے تحت سب سے قدیم نسخہ تاشقند کی لائبریری، ابوریحان بیرونی میں ۱۵۱-۱-۱۷۸ کے تحت موجود ہے۔ مگر اس پر لکھی تاریخ ۶۷۷ھ صحیح نہیں ہو سکتی جبکہ فہرستنگار کا خیال ہے کہ اس کے بعض اوراق خود شاعر کے دستنوشت ہیں۔اس کے بعض اوراق مصوّر ہیں۔ نسخہ نفیس ہے۔ مگر اسی عنوان سے موجود برٹش لائبریری کے انڈیا آفس کلکشن کا نسخہ مورخہ ۸۶۶ھ مطابق ۱۴۶۲ء معتبر و مستند نسخہ ہے۔ اس میں دیباچہ غرۃ الکمال، غزلیات، رباعیات، قطعات مرکزی ستون میں اور حاشیہ میں خمسہ اور مفتاح الفتوح استنساخ ہیں۔

روم شہر میں ویسے تو کئی کتبخانے ہیں مگر مجھے ان میں سے صرف دو ہی نسخوں کی زیارت نصیب ہوئی ۔ ایک نیشنل اکیڈمی آف علوم جس کے کتبخانہ کا عنوان ہے: Biblioteca dell Academica Nazionale dei Linchei Corsionione اس میں کلیات امیرخسرو دهلوی کا نہایت خوبصورت نسخہ موجود ہے۔ نسخہ کے مندرجات

---

1. امیر خسرو کی نادر تصنیفات ترکی میں،پروفیسر امیر حسن عابدی، آجکل، خسرو نمبر (ص ۳۶) نئی دہلی، ۱۹۷۴؛ جولائی ۲۰۱۰ء میں راقم تاشقند کے سفر میں اس نسخہ کی زیارت نصیب ہوئی ۔

سے قبل یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس نسخہ کو اٹلی کے ایک اسلامشناس اسکالر بنام لو ونے کیتانی [Leone Caetani, 1869-1935] جس نے ۱۹ ویں صدی کے آخری دھائی میں مرکزی ایشیا، ایران، عراق اور ھندوستان کا سفر کیا ولی قبل از سفر عربی، فارسی روم یونیورسٹی کے اساتذہ ایگزناز یو گایڈ [Ignazio Guide] اور گایکامو لیگنیا [Giacome Lignena] و دیگر اساتذہ سے ترکی اور سنسکرت زبانیں سیکھ چکاتھا اور اپنے سفر کے دوران جو قلمی نسخے اور دیگر کتابیں جمع کی تھیں ان کو اسی اکیڈمی کے حوالے کردیا۔ مشہور شرقشناس پروفیسر آنجلو پیایمونتیزو[1] [Angelo Piemontese] اس کتبخانے کے فارسی اور عربی نسخوں کی فہرستنگاری کی یادرہے کہ یہ وہی نامور محقق ہیں جنہوں نے شاھنامہ فردوسی کا فلورنس کا نسخہ دستیاب اور متعارف کروایا ہے۔

درج بالا اس کتبخانے میں کلیات امیرخسرو [2] کے عنوان سے بھی ایک نفیس نسخہ تحت شمارۂ Or.83موجود ہے۔ اس نسخہ کی جلد کے

---

1. بتاریخ ۱۷ فروری ۲۰۱۴، کو وٹیکن ، روم کی لائبریری میں اس معمّر و محترم استاد سے اتفاقاً ملاقات ہوئی ۔

2. راقم الحروف اس کتابخانہ کی انچارج Dott. Volentiana Sagaria Rossi کا ممنون ہے کہ انھوں نے ایک ہی دن میں مجھے اس نسخے کے کئی اوراق خاص طور پر دیباچہ غرۃ الکمال کی الکٹرونک کاپی مہیاکرا دی، اسی طرح پروفیسر رحیم رضا اور جو کہ روم یونیورسٹی کے پروفیسر پاپولا اورستی شرقشناسی شعبہ میں فارسی کی استاد ہیں کا بھی میں نہایت سپاسگزار ہوں کہ انھوں نے خسرو کے قلمی نسخوں کو دیکھنے کے لیے روم کے دونوں کتبخانوں میں میرے لیے سھولیات کا انتظام کیا۔

آخر میں A38, A39 کے تحت مرکزی اور حاشیہ میں اندراجات کی طرف بھی اشارہ دیا گیا ہے۔ اس نسخہ کے کل اوراق۸۶۷ اور یہ ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۰۳, کا ہے۔ اس نسخہ کے متن میں تحفتہ‌الصغر، دیباچہ اور دیوان [۴ب-۵۵ب]؛ وسطالحیاۃ، دیباچہ اور دیوان [۵۶الف-۱۳۸الف]؛ غرۃ الکمال، دیباچہ [1] اور دیوان[۱۳۸ب-۱۸۲ب]؛ اس کے بعد کچھ خالی اوراق ہیں غالبا وہ استنساخ کرنے سے رہ گئے ہیں، اس نسخہ میں مثنوی مفتاح‌الفتوح جوکہ تیسرے دیوان کا ہی ایک حصّہ ھے بھی علیحدہ طور پر اور اکثر نسخوں میں منسلک بھی ہے۔[۳۰۳-۳۳۷]؛ نہایت‌الکمال و بقیہ‌نقیہ دیباچہ کے بغیر [۳۳۷ب-۸۶۷ب]۔ حاشیہ میں خمسۃ امیرخسر و کی مثنویاں اور نہ سپہر، خضر خان (دولرانی درج نہیں ہے)، قران السعدین ۸۳۹ ورق تک اور بعد از ان رباعیات ہیں۔ تمت میں روایتی انداز میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

یا ربّ اوّل از قبول خود بیارای این کتاب و انکہ از باران رحمت شوی و بپذیر این دعا.

اور پھر:

تمّت الکتاب بعون الملک
الوھاب الفقیر الحقیر درویش محمّد.

---

1. اس کے دیباچہ اور شایع شدہ دیباچہ میں بعض اختلافات ہیں جس کا ذکر آئندہ کسی مضمون میں کیاجائے گا ۔

مہدی بیانی نے اپنی معرکۃ الارا تصنیف «احوال وآثار خوشنویسان[1]» میں پر لکھا ہے کہ:

از کاتبان گمنام قرن دهم و بخط وی یک نسخهٔ گلستان سعدی در کتابخانهٔ سلطنتی[2] بقلم نیم دو دانگ متوسّط، با رقم تاریخ: تمام شد کتاب گلستان غرّهٔ شهر ربیع الاخر سنة ۹۳۵ علی ید العبد الضعیف درویش محمّد الکاتب غفرالله ذنوبه.

اسی نام کا ایک اور کاتب کا ذکرص ۱۰۶۸ پر بھی ہے وہ مگر اس کا نمونہ ۱۰۶۷ھ کا درج ہے جو غالبا اول الذکر والا ہونا ممکن نہیں یعنی اتنی طویل عمر رہا ہو۔ و الله اعلم باصواب۔

اسی کے آخری ورق پر خط تعلیق میں کتب الحقیر الفقیر درج ہے اور ایک مہر کا نشان باقی ہے جس پر سیاھی زدودہ کر مٹا دیا گیا ہے۔ یہ نسخہ جسے لوونے کیتانی نے ہندوستان سے خریدا تھا ضرور کسی مشہور کتبخانہ کی رونق رہا ہوگا اور بیچنےوالے نے اس کے مالک

1. مہدی بیانی، احوال و آثار خوشنویسان، انتشارات علمی، تہران، ایران، ۱۳۵۸هش، ج ۳-۴، ص 187۔

2. غالباً اس کا نام اب تبدیل ہو کر کتابخانۂ مجلس ہو گیا ہے۔ اس کے بعض مصوّر نسخہ کا تجزیہ و تحلیل استاد س.پ. ورما (شعبۂ تاریخ علیگڑھ) نے اپنی کتاب، مغل پینٹرز میں کیا ہے۔

یا کتبخانہ میں نشانی جو مہر کی شکل میں موجود تھی دنیائے ہستی سے مٹادی اپنا گناہ چھپانے کے لیے۔

انگلینڈ کے اکثر کتبخانوں میں حضرت امیرخسرو کے نفیس خطی نسخے موجود ہیں۔ اس کی دو وجہ ہوسکتی ہیں: اول یہ کہ کسی کسی جگہ سے پورا کتبخانہ انگلینڈ یا یورپ چلاگیا چونکہ اس کی سند پیرس کی ببلیوتھک ناسنیول میں محفوظ بعض قلمی نسخے پر درج عبارات سے ہوتا ہے۔ ان میں حصول شدہ کتبخانہ کی تمام کتابوں کے عناوین ثبت ہیں۔ لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ صرف نفیس اور قیمتی قلمی نسخوں کو یہاں سے لےجایا گیا۔ بھرحال، کلیات امیرخسرو عنوان کے تحت ایک برٹش لائبریری میں خوشخط نسخہ کی زیارت ہوئی۔ ویسے تو اس کتبخانہ میں خسرو کے نسخوں کا ذخیرہ ہے۔ کلیات امیرخسرو کا یہ نسخہ تحت نمبر ۲۱،۱۰۴ مورخہ ربیع‌الاوّل ۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۷ء کا دستنوشت ہے۔ اس میں اوّلین چار دیوان، خمسہ، مثنوی دولرانی و خضر خان موجود ہیں۔ نسخہ نہایت خوشخط ہے۔

روم شہر میں ہی موجود دین عیسائیت کا قبلہ و کعبہ وٹیکن شہر اپنے آپ میں ایک ملک کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس شہر کی لائبریری جس کا نام Biblioteca Apostolica Vaticana ہے میں بھی امیرخسرو کی مشہور مثنوی قران‌السعدین تحت شمارۂ ۱۵۳ بخط نستعلیق متوسّط بقلم عطاءاللہ قادری مکتوبہ ۱۷ رجب ۱۲۵۷ھ کا نسخہ موجود ہے۔ اس میں ۱۵۶ اوراق ہیں۔ تمت (انجام متن):

یہ متن کا تتمہ ہے مگر اس کتبخانہ کے کتابدار جناب ایٹور روسی [Ettor Rossi] نے ۱۹۴۷ء میں اس کتبخانہ کی فہرست مرتب کی اور اسے کاتب کے نوشتہ دعایہ کلمات سمجھ کر اسے تمت قرار دے دیا جبکہ تمت حسب ذیل ہے:

قاریا چندین مکن بر من عتاب
گر خطایی رفته باشد در کتاب
ای خطایی رفته را تصحیح کن
از کرم الله اعلم بالصواب

تمّت تمام شد کتاب مستطاب مسمّیٰ باسم قران السعدین من تصنیف ابلغ البلغ او افصح الفصحا امیرخسرو دهلوی از دستخط فقیر الحقیر عطاءالله قادری اللّٰهم اغفرله ولدالدیه و احسن الیه ماو الیه در تاریخ هفدهم شهر رجب المرجب ۱۲۵۷.

متن دو ستونی اور ہر ستون میں ۱۳ بیت موجود ہیں۔

اسی طرح خمسۂ امیرخسرو کے عنوان سے بہت سے قلمی نسخے یورپ اور انگلینڈ کے کتبخانوں میں دستیاب ہیں۔ جرمنی کے سیٹ ببلیوتھک میں موجود تحت نمبر ۱۲۷۸ [Or.1278] بعنوان خمسۂ امیرخسرو قلمی نسخہ اپنی نوعیت کا منفرد نسخہ ہے۔ اس پر درج نوّاب عبدالرّحیم خان‌خانان، شاهجهاں کی تحریر اور اورنگزیب کی

بیضوی مہر سے اس کی تاریخی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔
عبدالرّحیم خانِ‌خانان کا بیان ہے کہ:

اللہ اکبر، در سال هزار و دوازده ورقی چند از این خمسة نفیسه شریفه بقلم شریفه میر باقی سمرقندی از گجرات آمد و آورد چون از باقی کتاب استفسار شد بعد از تجسّس بسیار معلوم شد که یک کتاب با صد ورق دیگر پیش میرزا عبدالملک است انعام آدمیانه نموده ازو گرفتیم و تتمة کتاب را بعد از پرسیدن بسیار از هرکس شنیدیم که در گجرات هرکسی باشد هرچند ورقي بوده است باز میر باقي را با دو سه هزار روپیه فرستاده باشد که از بیش باشد که باشد هرچه او خواهد داده آن اوراق بیارد و بعنایت الهی چنان شد نسخه تمام این پنج کتاب بدست مگر ورقي چند که ضایع شده باشد از این چنان ده پانزده ورقي را شخصي داشت بگمان اینکه خود بیارد و چیزي بیشتر

بیابد و چنان شد با چند کتاب دیگر از... گرفته متوجة اگره شد و آن ایّام بود که این غریب همراه مهابت خان تهمت زده بسعایت ملتزمان صاحب عرض بدرگاه رفته بود از انجا که نیّت درست بود و راستي که کمال دولتخواهي در درجة اعلٰي بلطف الٰهي در صورت عنایت بندگان والاي سلیماني مکاني ظهور یافته از آن بلایا خلاصي یافته:

اگر تیغ عالم بزد رگي تا نخواهد
[illegible]

معاینه دیده شد مجملاً آن فرد که اوراق این کتاب را با کتابهاي دیگر مي‌آورد در راه دوزدي شد و آن دوازده ورق را بردند بهرحال این کتاب لطیف شریفي که خط مولا سلطان علي و تصویر استاد بهزاد بود بتمابر استاد و تصویرها که در بعضي جا افتاده بود آنها را چون اصلاح نمایند و آن ورق چند نیز که برده بودند بمحمّد مؤمن استاد امر کرد که

بنویسد و جلدسازان را فرمود که زردوزی نمایند و حواله دهند تا زیب و زینت بدهند تا اینکه ده یازده سال کار میکردند تا بتمام رسید و اینچنین که در تاریخ هزار و شش یافت شد، حره عبدالرّحیم ابن محمّد بیرم خان.

اس پورے «U» شکلی متن کے در میان شمسہ منقّش ہے اور اس کے وسط میں «برسم کتبخانۂ نوّاب خانِخانان عبدالرّحیم میرزا خان ابن خانِخانان محمد بیرم خان اتمام در ۱۰۲۶ھ» ثبت ہے۔ یہ امر شاید ہی کسی فارسی-اردو کے محققین غالبا واقف نہو کہ خانِخانان کی اپنی ذاتی غنی لایبریری تھی اور اس میں محض کتابیں (قلمی، ظاہری بات ہے اس وقت طبع شدہ کتابیں نہیں تھیں) ہی نہیں بلکہ کتابسازی اور اس کے آرایش کے تمام اساتذہ و ماہر فنکار اس میں منسلک تھے۔

بالا مذکور متن اس امر کی شہادت کا مبین ثبوت ہے۔

اس متن کے اوپری حصّہ میں درج ہے: قیمت...... روپیہ [اس کے بیچ کا حصّہ ضایع ہو گیا ہے]۔ لیکن اس کے آخری ورق پر دی گئی تمت کے نیچے دیے گئے متن میں اول: شمسہ، لوح، ۸ مجلس، اور سب سے نیچے کے گوشہ میں درج ھے: **سی و شش موضع قیمت پنج هزار مستعارلی»** سے صاف پتاچلتا ہے کہ یہ نسخہ پانچ ہزار روپیہ اکبری دور میں، مستعارلی: ہاتھوں ہاتھ تبدیل

یعنی بدلہ مراد خرید کیا گیا۔ ظاھری بات ہے جس نسخہ پر بہزاد کی تصویرگری کی ۳۶ طرح کی ھنرنمائی ہو وہ سستہ کیسے ہوسکتا تھا، عبدالرّحیم خانِخانان کی عبار ت کے عین اوپر شاہجہاں بادشاہ کی تحریر اورنگزیب کی بیضوی مہر ثبت ہے ۔

دراصل یہ نسخہ، جیسا کہ اس کی تمت میں درج ہے ۹۰۰ھ، میں قلمبند ہوا، غالبا یہ نسخہ ایران میں تیار ہوا ہوگا جس کا مبیں ثبوت اس میں بھزاد کی مستند تصویرنگاری ہےبھزاد کی تصویرنگاری پر ھلکا آسمانی رنگ غالب ہے مگر چہروں کی مناسبت اورکرداروں کے قد و قامت اورلباس دیکھنے میں بنتےہیں(نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو اس کی ایک تصویر جس میں فرھاد جوے شیر کنی کے لیے گامزن ہے)۔

افسوس کاتب کا کہیں ذکر نہیں مل سکا، پورا نسخہ ورق بورق پڑھاجانے تو شاید کہیں اشارہ مل جانے۔

ان تینوں اھم تحریر کے علاوہ اس نسخہ میں خمسۂ امیرخسرو کی پانچوں مثنویاں مکمل موجود ہیں۔ جن کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ مطلع الانوار: ورق ۲ب -۴۳ب۔

۲۔ خسرو و شیرین: ۴۴الف-۹۵ب۔

۳۔مجنوں و لیلی: ۹۶الف-۱۲۷ب۔

۴ ۔آینۂ اسکندری: ۱۲۸ الف-۱۷۰الف۔

۵۔ هشت بهشت: ۱۷۱ب-۲۲۵ ب۔

کمال بہزاد کی مصوّری کا نمونہ

Ex
Biblioth. Regia
Berolinensi
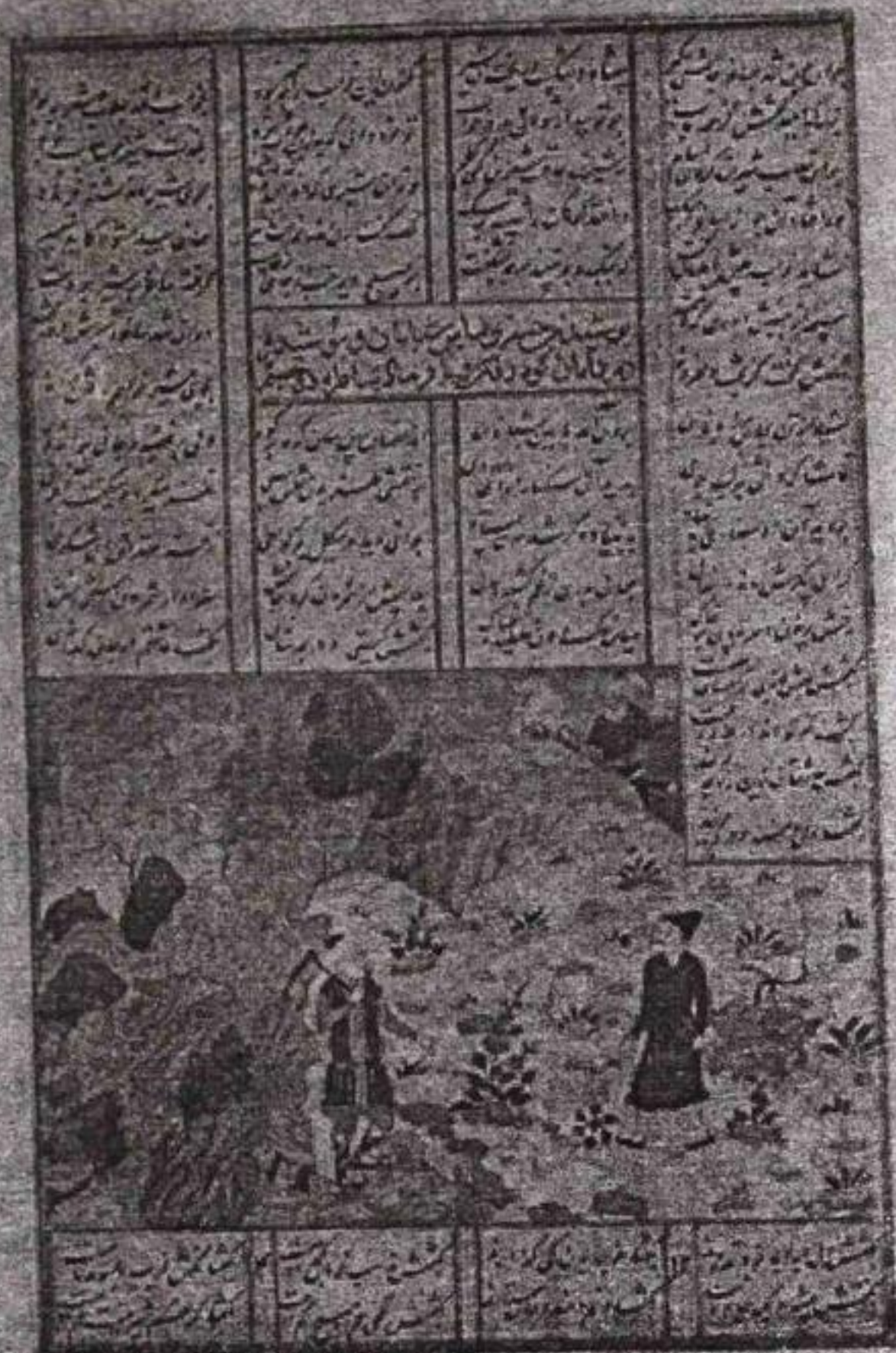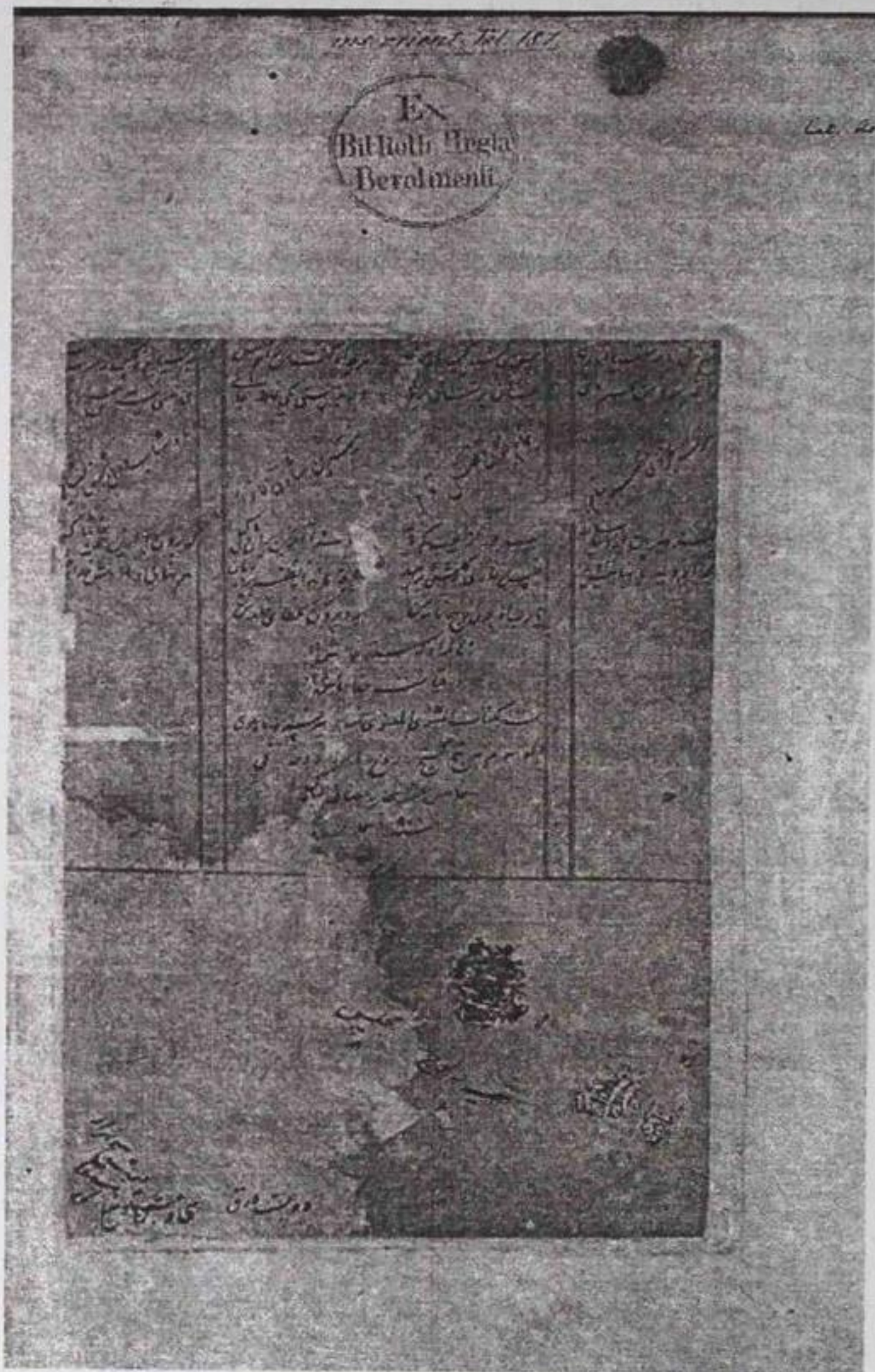
ورق تمت

اسی کتبخانہ میں خمسۂ امیرخسرو کا ایک اور مصوّر نسخہ Or.187 کے تحت موجود ہے۔ اس کے آغاز میں فلای لیف پر شمسہ کے بغل میں عبدالسّلام اسلام خان شاہجہان راطب ثانی کی مہر نقش ہے۔ اس میں متن گلابی رنگ کے کاغذ پر چار ستونی میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی تمت میں جس کے مطابق خمسۂ امیرخسرو کو مثنوی معنوی کہا گیا ہے سن استنساخ بھی درج ہے:

تمّت الکتاب المثنوی المعنوی خمسة امیرخسرو دهلوی الموسوم به پنج گنج فی خامس عشر شهر رمضان المبارک، ۹۰۵.

نسخہ میں شیراز اسکول کی تصاویر موجود ہیں۔ آخر کے فلای‌لیف [Fly Leaf] پرکسی عالم کی تحریر ہے جس نے نقاشی کے متعلق بھی اظہارِخیال کیا ہے۔ اس نسخہ اوردوسرے خمسہ کے نسخوں میں ایک تصویر بہت مشترک ہے جس میں شیرین کو ایک گھوڑے پر سوار فرہاد کے ہاتھ میں شیشہ لیے دکھایاگیا ہے یہی تصویر اس نسخہ میں بھی ہے۔

یہ نسخے اودہ سے متعلقہ اشپرنگر کلکشن کے نہیں ہیں۔

اسپرینگر کلکشن کے نسخوں میں نسخہ نمبر ۱۴۴۱ اور کتبخانہ کی فہرست کا نسخہ جو نمبر ۸۵۸ قدیم (M858 pp Old) بعنوان دواوین خسرو موجود ہے۔ اس میں ۴۲۹ اوراق اور دو ستونی و سیاہ و

سرخ رنگی روشنائی سے مرقوم ہے۔یہ دواوین خسرو کا منتخب مجموعہ اور بیشتر غزلیات پر مبنی ہے۔ ۴۰۶ ورق تک صرف غزلیات ہیں اور پھر رباعیات اور قطعات وغیرہ۔

ہر غزل یا ایک ہی بحر کی غزلوں سے قبل بحر کا نام اور اس کے وزن کے ارکان درج ہیں جیسے آخری غزل کے آغاز میں سرخ رنگی روشنائی سے تحریر ہے:

بحر متقارب مثمن فعولن فعولن فعولن
ه ا نش، فعه ا،
مرا دوش گویي بخواب بکف کرده جام شراب
آمده، آمده،
زمن بر شکستي در وصل بستي
نکیا،گ نکیا،گ.

اس کی تمت میں روایتی انداز میں درج یہ دعائیہ بیت ہے:

خسرو چو سلامت نکند عبث که ترا دید چه روای
سلامت
هر که خواند طمع [دعا] دارم زانکه بنده
گنه کا،ه

یہ نسخہ اوّل شمس الدّولہ نجم الملک احمد علی خان صولت جنگ بہادر ۱۲۱۳ھ کی ملکیت میں رہا اسی کی مہر بھی آخری ورق پر نقش ہے۔ حالانکہ ورق اوّل پر ایک دوسری مہر جلال الدّولہ مہدی علی خان جنگ بہادر ۱۳۰۳ھ کے نام سے ثبت ہے۔ مہر کے سن سے ظاہر ہے کہ یہ اوّل الذّکر کے ہی جا نشین ہوں گے۔ اسی ورق پر ایک شعر درج ہے:

اي ز خیال ما برون در تو خیال
کسـ ا ـسد
با صفت عقل را لاف کمال کي رسد

اس نسخہ پر ایک اور مہر موجود ہے جسے مٹا دیا گیا ہے اور اس کے بعد مرقوم ہے:

حوالہ لالہ نند رام گردید
ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ.

اس کے علاوہ ۳ربیع الثانی بجای رسید اور ۱۲۴۱ بجای رسید بھی درج ہے۔ بہ ہرحال نسخہ دیدنی و درود بر مالکش.

ببلیوتھیک پیرس، فرانس میں امیرخسرو کے تقریبا ۳۱ نسخے موجود ہیں۔ انمیں بیشتر خمسہ، بعض میں پانچوں اور کچھ میں مفرد مثنویاں موجود ہیں۔ استاد فرنسس ریچرڈ نے اپنے دوجلدی کیٹلاگ میں ان سب کا جامع حال لکھا ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ امیرخسرو کی ان ہی زمانۂ حیات اور نزدیکی وقت میں شمالی ھند سے مغربی و مشرقی و دکن میں پہنچ چکی تھی . اسی طرح خراسان اور ایران میں ان کی شہرت بطور امیرخسرو بلخی اور طوطیِ‌ہند اس دور کی تصنیفات، حافظ اور جامی کے کلام سے لگانی جا سکتی ہے۔ حافظ کی مشہور غزل: «شکرشکن شوند ھمۀ طوطیانِ ھند» میں اصل اشارہ امیرخسرو کی جانب ہی ہے۔ پیرس کے مخطوطات فرانسیسوں کے ذریعہ فرانس میں پہنچے اس بات کی تأیید ان مخطوطات کے فلای لیوز پر مرقوم عبارات سے ہوتی ہے۔ بعض کے عنوان ان میں شامل کتابوں پر مبنی ہیں۔ ایک نسخہ کا عنوان دیا گیا ہے «ثمانیہ خسرو»، نسخہ نمبر ۶۲۷. اس میں خمسۂ امیرخسرو (۱ب -۲۴۱ب) اور ان کی دولرانی و خضر خان(۲۴۲ الف-۳۰۲الف)، قران‌السّعدین

(۳۰۲ب-۳۵۴ب) اور نہ سپہر (۳۵۵الف-ب۴۱۱)اور اس پر تاریخ تمت تو نہیں مگر ایک مہر جسے مٹا دیا گیا ہے کہ نیچے ۹۹۴ھ عرض شد کچھ فاصلہ پر شوّال ۹۹۱ھ بمطابق اکتوبر ۱۵۸۵، عرض دید شد ثبت ہے۔ اس کے علاوہ اسی ورق پر محمد قلی قطب شاہ کی مہر مورخہ رمضان ۱۰۲۳ھ بمطابق اکتوبر ۱۶۱۴، بھی جلوہ گر ہے۔

مگر عین مماثل اسی عنوان کے ایک نسخہ کا ذکر مہدی بیانی نے قطبشاہی دور کے مشہور کاتب محمد سعید ہروی کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے بھی کیا ہے۔ اس کا بھی عنوان بالکل یہی اور اس کا سن کتابت ۹۷۲ھ لکھا ہے۔ عبارت مندرجہ ذیل ہے:

از کاتبانِ دربارِ قطبشاه هندی و بخط وي یک نسخه ثمانیه امیرخسر دهلوی در کتابخانة سلطنتي است، بقلم کتابت خفی متوسط، که چنین تمام می‌شود:

تمام شد ثمانیة خسرو دهلوي برسم خزانة... اعلیحضرت قطبشاهي... بدست کمترین بندگان درگاه خسروي، محمّد سعید بن مسعود الهروي، در سال نهصد و هفتاد و دو از هجرت نبویه[1].

1. مہدی بیانی، احوال و آثار خوشنویسان، ج ۳-۴، ص ۷۴۷.

دونوں نسخہ غالبا ایک ہی جگہ مرقوم ہونے نظر آتے ہیں۔ ایک ایران کی سلطنتی (کتابخانۂ مجلس)، تہران اور دوسرا پیرس کی مذکورہ لائبریری میں پہنچگیا۔ گویا دو جڑواں بھائی ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ ایران میں خسرو کی شہرت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دیوان کا ایک نسخہ بقلم مشہور و معروف خطّاط سلطان علی مشھدی مورخہ «في يوم الاثنين خامس عشر شهر جمادي الثّاني سنة احدي و ستين و ثمانمايه... كتبه العبد الضعيف سلطان علي» کتابخانۂ مھدوی، تہران میں محفوظ ہے[1]۔

اسی ضمن میں یہ بھی یاد رکھاجائے کہ پندرھویں صدی تک نہ صرف امیرخسرو کے کلام اور دیگر نثری شاھکاروں کے نسخے مرتب ہورہے تھے بلکہ ان کی کتابوں کے ترجمے دکنی میں شروع بھی کئے جا رہے تھے۔ ان کی مثنوی نہ سپہر جس میں دکن اور خاص طور پر وہاں کی صنعت پارچہبافی اور موسیقی و رقص لولیاں کا مفصل ذکر ملتاہے کا ترجمہ ۱۵ویں صدی کے آخر میں ہوچکا تھا (ملاحظہ ہو: تاریخ ادب اردو، جمیل جالبی، دکنی ادب سے متعلق باب)، اس جملۂ معرضہ کےلیے معاف فرمائیےگا۔ اسی طرح نسخہ نمبر ۱۵۳۶ میں نظامی کا اسکندرنامہ (ورق ۱ب سے ۲۲۶ب تک) اور خردنامہ اوّل اور پھر امیرخسرو کی آینہ‌اسکندری (ورق ۳۶۰ب) اور

---

1. ایضاً، ص ۲۶۶۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران میں امیر خسرو کے کلام کے قلمی نسخوں پر ایک علیحدہ مقالہ کی ضرورت ہے۔

پس ازاں نظامی کی ہفت‌پیکر اور ہشت‌بہشت درج ہے۔ اس نفیس نسخہ کا کاتب علی ابن میرکوھی متخلص نظیری اور اس کا محل کتابت جیول اورسنِ کتابت دوم شعبان ۹۷۸ھ مطابق۲۹ دسمبر ۱۵۷۰, تمت میں درج ہے۔ یہ نسخہ نظامشاھی بادشاہ مرتضیٰ نظامشاہ (دورۂ حکومت: ۱۵۶۵-۱۵۸۶,) احمدنگرکی ایک جاگیر بنام جیول مرقوم ہوا جس پر بعد میں شیواجی مراٹھا کا قبضہ ہوگیاتھا میں قابلِ فہرستنگار نے اسے بادشاہ غازی اسلام نظامشاہ مرتضیٰ، جیساکہ نسخہ کی تمّت میں درج ثبت کردیا مگر بادشاہ کا نام صرف مرتضیٰ نظامشاہ ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیاگیاھے کہ خسرو کا کلام خراسان و ایران میں کافی مشہور رہا اور ان کےنسخوں کے نسخے خراسان اور صفوی دور میں قزوین اور تبریز قلمی بڑی آب و تاب سےمیں بنائے گئے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض کاتبوں اور تاجروں کے ذریعہ دکن میں پہنچے ہوں اور بعد از اں یہاں سے فرانس اور یورپ کے دیگر حصوں میں۔ اس کتبخانہ میں بعنوان «خمسة امیر ناصر الدین خسرو دھلوی» کے درج ہے۔ ظاھر ہے یہ غلطی غالباً کتبخانہ کے کارکن کے ذریعہ زد ہونی ہے۔ مگر اسی طرح کے عنوانات نے امیرخسرو کے کارناموں کی تعداد میں بھی بیحد اضافہ کرنے کا رول ادا کیا ہے۔

یہ مذھب و مصوّر نسخہ صفوی شہزادہ بھرام میرزا کی ملکیت میں رھا۔ نسخہ میں اوراق کی کل تعداد ۳۳۱ اوراق ہیں اور اس کا

کاتب شاہ محمد نیشابوری تھا[1]۔ اس کا سنِ تصنیف 61-۹۶۰ھ بمطابق 54-۱۵۵۳ رہا ہے پیرس کی اس عظیم لائبریری میں امیر خسرو اور نظامی گنجوی دونوں کی مثنویوں پر بھی مشتمل نسخے موجود ہیں (حتماً دوسرے کتبخانوں میں بھی ہوں گے)۔ نسخہ تحت نمبر ۱۵۳۵ مذھب و مصوّر اور مورخہ جمادی الثّانی ۸۰۰ھ مطابق مارج ۱۳۹۸ء، اس کی قدامت قابلِ ملاحظہ اور بہت اھم نسخہ ہے۔ اس کے مرکزی ستون نظامی کے خمسہ کی مخزن الاسرار اور خسرو و شیرین اور حاشیہ میں امیر خسرو کی مطلع الانوار اور شیرین و خسرو مثنوی سے آراستہ ہیں۔

اسی زمرہ کا ایک اور نسخہ بعنوان خمسۂ امیر خسرو تحت نسخہ نمبر ۶۳۱ اسی کتبخانہ میں محفوظ ہے۔ مگر اس میں خمسہ کی صرف دو مثنویاں مرقوم ہیں۔ کل تعداد اوراق کی ۸۹ اور مورخہ ذی القعد ۸۸۶ھ بمطابق 82-۱۴۸۱۔ یہ نسخہ بخط ثلث مانند شہر شیراز دار السلطانیہ میں کتابت ہوا۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ۱۵ویں۔ نصف اوّل ۱۶ویں صدی تک شیراز نسخہ‌سازی کی بڑی منڈی تھی، اسی دور میں یہاں نقاشی کا شیراز اسکول پروان بلکہ عروج پر پہنچا۔ ھرات اسکول کے بعد ایرانی یا اسلامی اسکول کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ گولکنڈہ یا دکنی نقاشی اسکول پر، چونکہ شیراز سے ایک بڑی تعداد میں فنکار و نقاش وہاں آئے تھے اس کے اثرات خاصہ نمایاں

1. مہدی بیانی کے مطابق یہ مالک دیلمی کا شاگرد تھا اور اس کے قلم سے مرقوم کئی نسخوں اور مرقعات پرشاہ محمد مشھدی بھی درج ھے (صص 95-293، ھمان)

نظر آتے ہیں۔ سالارجنگ سے شایع گلشن مصوری جس میں اس کتبخانہ میں شیراز اسکول سے متعلقہ قلمی نسخوں کا مفصل ذکر ہے نے بھی اس امر کی تایید کی ہے[1]۔

ویانہ (آسٹریہ) میں ایران‌شناسی کا ایک بڑا مرکز وہاں کی علوم انسانی و ہنر کی اکادمی میں قائم ہے۔ مگر اس میں ہندوستانی فارسی اور خاص طور پر شاہجہاں کے دور پر مسلسل تحقیقی کام انجام دیے جارہے ہیں۔ مشہور اور تاریخ‌شناس پروفیسر اباکوک [Ebba Koch] بھی (علا وہ بطور استاد تاریخ، ویانہ یونیورسٹی) اس ادارہ سے منسلک ہیں[2]۔ اسی شہر میں موجود نیشنل لائبریری میں خسرو کے دواوین، خمسے اور تاریخی مثنویوں کے ۹ نسخہ جو مختلف ادوار سے متعلق ہیں موجود و محفوظ ہیں۔ اس کی تفصیل یہاں کی فہرست جسے فارسی میں (تین جلدیں) انتشارات موقوفات افشار (تہران) نے شایع کیا ہے موجود ہے۔

ترکی کے مشہور شہر استنبول، جسے قدیم زمانہ میں قسطنطنیہ کہاجاتا تھا میں کئی کتبخانہ ہیں۔ ان میں توپا قاپی محل،سلیمانیہ اور حکیم (خراج) اوغلو پاشا، کے کتبخانوں میں امیرخسرو کے بیشتر

1. Gulshan-e-Musawwari, eds. Karl Khandalavala & Rahmat Ali Khan, Salar Jung Museum, Hyderabad, 1986, p.3. For more information on Shiraz School of Painting, pl see: Turkman Governors, Shiraz Artisans and Ottoman Collectors, XVIC Shiraz Manuscripts, Lale Ulcu, Is Bankasi Kulture Yayinlari, Istanbul, 2006.

2. اسی ادارے کی دعوت پر راقم‌الحروف نے شاهجهانی دور میں دیباچہ‌نگاری پر ایک سپیشل لکچر 12/فروری ۲۰۱۴ اور اسی سفر میں اس لائبریری کی زیارت کی۔

مصوّر نسخہ موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر ظ.انصاری صاحب نے خسرو پر منعقدہ جشن ۱۹۷۵ء کے موقع پر جو بروشر ریلیز کیا تھا، اس میں ہیں۔ اسی طرح خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی کتاب، دول رانی و خضر خان[1]، میں اس کتاب کے مختلف نسخوں کا ذکرکرتے ہوئے صرف حکیم اوغلو اور صوفیا کے دو نسخوں کا ان کے قدیمترین نسخے ہونے سے متعلق ذکر کیا ہے۔ مگر توپا قاپی کے خزانہ میں اور صوفیا میں موجود دو اور نسخوں کا ذکر دونوں بالا مذکور محقّقین نے نہیں کیا ہے۔ نسخہ نمبر ۶۸۴ بعنوان مثنوی دولرانی و خضر خان توپاقاپی سرای کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ اس مصوّر و مذہب نسخہ میں ۱۶۳ اوراق خوبصورت خط میں نوشتہ ۹۹۲ھ کے ہیں۔ آخری تین اوراق اشعار اختتامیہ مثنوی دولرانی و خضر خان چلیپا انداز میں نستعلیق جلی میں کتابت ہوئے ہیں۔ تمت کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

«تمت الکتاب بعون الملک کتبہ العبد محمّد شریف الحسینی الاصفھانی غفر ذنوبہ ۹۹۲ھ» مرقوم ہے۔

۲۰۰۸ء میں منعقدہ بین‌الاقوامی سیمینار میں ترکی کی معروف محقّق ڈاکٹر لالہ‌الوچ نے اس نسخہ سے متعلّق مضمون پڑھا جسے راقم‌الحروف نے اس کانفرنس کے مجموعے میں شایع کیا ہے[2]۔

---

1. Duwal Rani wa Khizr Khan, ed. K.A. Nizami, Idarah-e-Adabiyat-e-Dilli, Delhi-110006, 1988, pp.50-52.
2. Comments on the Amir Khusrav Dehlavi's Work's Mss from the Imperial Ottoman Treasury, Lale Uluch, in Historiography in

اسی طرح لیڈن یونیورسٹی کے کتابخانے جس میں مختلف جنوبی اور مشرقی ایشیا یی زبانوں کے کئی ہزار خطی نسخے موجود ہیں جن کا کٹلاگ ۲۶ جلدوں پر مشتمل ہے میں بھی امیر خسرو کی، مثنوی قران السعدین اور خمسہ کا نسخے موجود ہیں۔

بھرحال یہ تو صرف کچھ نسخوں کامختصرا تھا جو راقم الحروف کو مذکور بالا کتبخانوں میں دیکھنے کا موقع ملا تلاش و تحقیق جاری و ساری ہے۔

India, Persian Lit, ed. Chander Shekhar, Department of Persian, University of Delhi, Delhi, 2009, pp.27-63.

عراق رضا زیدی
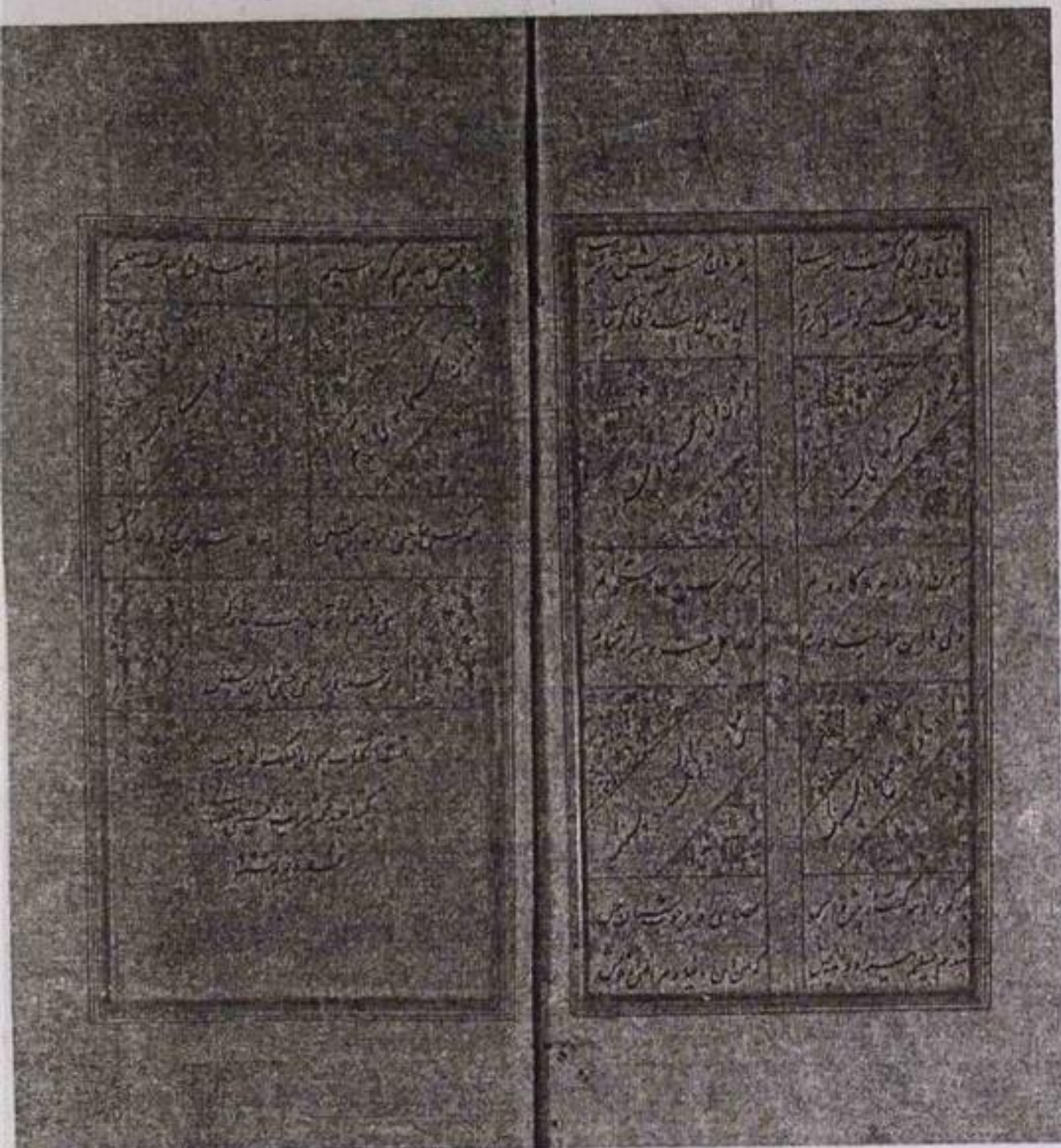
فارسی قصیدہ نگاری اور پروفیسر نذیر احمد

خدا کے فضل سے ۱۹۴۷ء کے بعد کا ہندستانی فارسی ادب ہر اعتبار سے قابل رشک ہے۔ جس میں تخلیقی ادب کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہر دہے میں ایک نہ ایک نیا شاعر ضرور سامنے آجاتا ہے۔ جس کا سہرا دانشگاہوں کے شعبہ ہای فارسی اور مدارس دینی کے سر ہے۔ صنف سخن میں غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مثنوی یہاں تک کہ تاریخ گوئی تک کی روایت کو آگے بڑھانے والے شعرا موجود ہیں۔ لیکن تحقیق و تدوین اور نقد کے میدان میں ہندستانی ادیب پاکستان و بنگلہ دیش پر فوقیت پاتے ہوئے افغانستان و ایران کے ناقدین و محققین اور مدوین کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ اگر صرف علی گڑھ اور دہلی پر نظر کی جائے تو یہاں پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی اور پروفیسر نبی ہادی جیسے دانشوران فارسی، ایرانی دانشوروں سے کسی طور کم نظر نہیں آتے۔ اسی بنا پر پروفیسر امیر حسن عابدی کو بابائے فارسی ہند کے خطاب سے نوازا گیا۔ پروفیسر نبی ہادی نے مغلوں کے ملک الشعرا، طالب آملی، میرزا بیدل جیسی کئی کتابوں کا تحفہ دیتے ہوئے ہندستان کے تمام ادباء و شعرا کی ایک ڈکشنری اور ایک مربوط تاریخ لکھ کر فارسی دنیا میں اپنا لوہا منوالیا۔ پروفیسر نذیر احمد نے اپنی ناقدانہ اور مدبرانہ حکمت عملی کو اپناتے ہوئے ہندستانی فارسی

ادب کو مالا مال کیا ہے ان کی شخصیت ہندو پاک کے علاوہ افغانستان و ایران میں بھی قابل تقلید ہے۔ وہ جدید تنقیدی و تدوینی پیمانوں سے آشنائی رکھتے ہوئے پرانی روایات کے دلدادہ رہے۔ خود متحرک رہتے ہوئے دوسروں کو متحرک رکھنا اور نئے دانشوروں کی مدد کرنا انکا حوصلہ بڑھانا موصوف کی فطرت میں شامل تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنے دور کے نئے ابھرتے ہوئے ادبا و ناقدین کے کاموں سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے۔ جس کی ایک ادنا سی مثال خود احقر بھی ہے کہ جس زمانہ میں راقم الحروف رباعیات حافظ پر کام کر رہا تھا۔ تو ایک دن کلچر ہاؤس ایران میں ملاقات ہوئی تو خیر و عافیت سے واقف ہونے کے بعد حافظ کی الحاقی رباعیات کے بارے میں سمجھانے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ میری مدد کس طرح کی جا رہی ہے۔ ایک ایک بات کو غور سے سنا اور مقالہ تحریر کرنے میں ان سبھی باتوں کا خیال رکھا۔ اسی شفقت، محبت اور مشوروں کا نتیجہ تھا کہ ان کے دار البقا کی جانب کوچ کرنے پر کئی تاریخی قطعات نذر نذیر احمد کیے۔ جنھیں پہلے پروفیسر ریحانہ خاتون نے اپنی کتاب شیخ الطائفہ ۲۰۱۰ء میں بعدہ، ایران کلچر ہاؤس سے شایع ہونے والے قند پارسی کے نذیر احمد نمبر میں جگہ ملی۔ دو قطعات یہاں نذر قارئین کیے جا رہے ہیں:

قطعہ تاریخ وفات استاد نذیر احمد

چرا شد جہان ادب سوگوار؟ جدا شد زما عالم بی نظیر!
حیاتش پی طالب علم بود شفیق و رفیق و انیس و نصیر
بیان کی کنم از صفاتش کہ بود معلم، مفکر، محقق، بصیر
کتب بینی و رس ود تدریس شغل ادیب و قلمکار و ناقد زہیر
قلندر صفت بود و آزاد مرد معزز میانِ صغیر و کبیر
بہ یک شنبہ و نوزدہ اکتبر نداد اد ہاتف بہ آہِ نفیر
باین طور تاریخ زیدی بگو خزان شد نوای ادب بی نذیر

۲۰۰۸ء

دوسرا قطعہ تاریخ در سنین صوری و معنوی: اس صنعت میں ایک سنہ صوری تو دوسری معنوی ہوتی ہے:

ادیب، ناقد و رھبر محقق و استاد	کتابھاش دانشوران کند تحریر
حقیقت است کہ او مردہ شد و لی زندہ است	درین شرافت و اخلاق و دانش و تحریر
بہ سوی خلد بقا از جھان فانی رفت	صدای انا الیہ دھند امیر و فقیر
بگو سنین بہ تاریخ عیسوی ھجری	ہزار چار صد و بست و نہ باہ نذیر
۱۴۲۹ھ	۲۰۰۸ء

قصیدہ ایک زمانہ تک فارسی شاعری کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ ایک دور میں اس صنف کی مقبولیت غزل سے بھی دو قدم آگے رہی ہے۔ لیکن قاآنی کے بعد اس صنف سخن کی جانب ناقدین نے طنز کے نشتر چلاتے ہوئے بزعم خود ہی ایک بیکار اور صرف درباروں کی مرہون منت صنف ثابت کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ دراصل ان خیالات کی بنیاد بھی خود ہندوستانی فارسی کے بزرگ ترین قصیدہ گو عرفی شیرازی نے ڈالی تھی۔ وہ کہتا ہے:

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی
کہ تو قبیلہ عشقت وظیفات غزل است

لیکن انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی میں قصیدہ کے خلاف یہاں تک معرکہ آرائی ہوئی کہ امتحان میں قصیدے کے زوال کے متعلق سوالات، جوابات کے لیے دیے جانے لگے۔ مشہور ناقد امداد اثر نے بھی ''قصیدے کے استعمال بد'' اور درجہ ابتذال تک پہنچنے کی بات کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''راقم نے قصیدے کی بحث متنبی کے قصیدہ گوئی کے لگاؤ میں کی ہے۔ جس سے قصیدے کے استعمال بد کی کیفیتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اسی پر فارسی اور اردو کی قصیدہ گوئی کو بھی خیال کرنا چاہیے کہ شعرائے دربار کی بدولت یہ صنف شاعری کس درجۂ ابتذال کو پہنچ گئی ہے۔''

بحر الفصاحت میں بھی اس صنف کو تمام خصوصیات کے باوجود ''آلودگی'' کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

''جس شاعر نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی اور امیر خسرو جیسے بزرگوں

کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔''

متذکرہ دانشوران و ناقدین کی پیروی میں آنے والے ناقدین نے تو قصیدہ نگاری کو بھٹئی تک کا مرتکب قرار دے دیا بقول کبیر احمد جائسی:

''اس صنف سخن کو مطعون کیا جانے لگا اور قصیدے کے یہ معنی قرار دیے جانے لگے کہ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں شاعر یا تو دروغ گوئی کا مرتکب ہوتا ہے یا پھر ''بھٹئی'' کا۔

ایسے ماحول میں پروفیسر نذیر احمد نے فارسی کی باشکوہ صنف سخن کی پیروی میں قلم کی جولانیاں دکھائیں اور صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ ثابت کر دکھایا کہ قصیدہ فارسی ادب کی ایک باشکوہ صنف سخن ہی نہیں ہے بلکہ قصاید تاریخ کو سمجھنے اور جانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ قصیدہ گوئی فارسی شاعری کا امتیاز ہے جس کے ذریعے فارسی شاعری میں نئے موضوعات شامل ہوئے ہیں۔ بقول پروفیسر کبیر احمد جائسی:

''استاد محترم پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس طلسم کو توڑتے ہوئے وافر مثالوں کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے کہ قصیدہ ہی وہ واحد صنف سخن ہے جو تاریخی مآخذ کے بھی کام آتی ہے اور جس کے مطالعے کے ذریعے شاعر کے زمانے کے تہذیبی سرمایے سے بھی واقف ہوا جاسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہی وہ صنف سخن بھی ہے جس میں اسلامی علوم معارف کے بہت سے ایسے نکات بھی محفوظ ہیں جن کے ذریعے سے ان کے ارتقا اور مسلمانوں پر ان کے اثرات سے بھی نہ صرف واقف ہوا جاسکتا ہے بلکہ ان کی ایک جامع تاریخ بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔''

پروفیسر نذیر احمد قصیدے کے متعلق جب ہندستانی نقادوں اور محققوں کے نظریات سے آشنا ہوئے تو فارسی قصائد کا از سر نو عمیق مطالعہ کیا اور ان نقادوں اور محققوں کے نظریات سے انحراف کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے:

ہندستانی نقادوں اور محققوں نے فارسی قصیدہ گوئی کے مطالعے کا حق ادا نہیں کیا بلکہ اکثر اس صنف کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کے ذمہ دار

ہوئے ہیں۔ میری اپنی نظر میں فارسی قصیدہ گوئی فارسی شاعری کا طرہ
امتیاز ہے۔ اس صنف شاعری میں فارسی قصیدہ نگاروں نے نئے نئے
موضوعات شامل کیے ہیں۔''

دراصل فارسی قصیدہ گوئی کے مطالعے کا حق تبھی ادا ہوسکتا ہے کہ جب ناقد یا محقق قصیدے میں بروے کار لانے اولے تمام علم و ہنر سے واقفیت رکھتا ہو۔ مثلاً علم نجوم، علم تاریخ، فلسفہ، منطق، علوم قرآن واحادیث و دیگر آسمانی کتابوں سے شناسائی کے ساتھ ساتھ علم عروض، تاریخ گوئی، علم معانی و بیان یہاں تک کہ علم موسیقی سے بھی واقفیت کے بعد ہی قصاید کے مطالعے اوراس سے نتائج برآمد کرنے کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ آج غزل کی مقبولیت نے ناقدین کو کسی دوسری صنف سخن کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھا ہے۔ حالانکہ خود غالب اس شاعر کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے جو قصیدہ گو بھی نہ ہو۔ بقول نجم الغنی خاں:

''مرزا غالب کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار کرنا نہ
چاہیے اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا
جانتے تھے۔''

خود پروفیسر نذیر احمد اخلاقی، مذہبی، عارفانہ تاریخی، قومی اور سیاسی مضامین کو موضوع بنانے اور موزوں کرنے کے لیے سب سے بہتر صنف قصیدہ کو ہی مانتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''غرض اخلاقی، مذہبی، عارفانہ، تاریخی، قومی، سیاسی وغیرہ موضوعات پر
شاعر کے بے لاگ اظہار خیال کے لیے قصیدے سے بہتر کوئی صنف سخن
نہیں۔''

دور حاضر کے مورخ فارسی قصاید کو عہد وسطی کی تاریخ کا ایک اہم مآخذ مانتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق پروفیسر ہادی حسن نے سب سے پہلے ۱۹۵۱ میں فارسی اشعار کا استعمال اپنی کتاب Mughal poetry its cultural and historical Value میں تاریخی مآخذ کے طور پر کیا۔ پروفیسر عزیز الدین حسین نے اپنی کتاب Structure of Politics under Aurangzeb in 2002 میں ان اشعاری مآخذ کے لیے ایک الگ chapter (باب) Persian poetry as a source of seventeen century قائم کیا۔ ان دونوں

دانشوروں کے درمیان ۱۹۹۱ء میں پروفیسر نذیر احمد نے فارسی قصیدہ نگاری کے ذیل میں قصاید کو تاریخی مآخذ کا دستاویز بتایا ہے۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعے میں ادبی ذرائع اکثر نظر انداز ہو جاتے ہیں حالانکہ شعرا کے دواوین اور ادیبوں کی تصانیف تہذیبی زندگی کے مسائل سے مالا مال ہوتے ہیں اور بعض تو سیاسی و تاریخی واقعات کے دستاویز کا کام کرتے ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نے اس کتاب میں جہاں فارسی قصیدہ نگاری کی تاریخ مرتب کی ہے وہیں قصیدہ گو شعرا کے تمام کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد کچھ نتائج اخذ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ قصیدے میں شاعر کی ساری صلاحیت ممدوح کی شخصیت کی برتری ثابت کرنے پر ہی مرکوز نہیں ہوتی بلکہ اس بہانے سے شاعر اپنے شاعرانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ صرف تشبیہ میں ہی پچاسوں موضوعات پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔ اس ذیل میں سب سے پہلا نام رودکی کا آتا ہے۔ جس کے کئی قصائد مثال میں پیش کیے گئے ہیں۔ عام طور سے رودکی کا ایک ہی قصیدہ

بوی جوی لولدان آید ہمی

یاد یار مہربان آید ہمی

موضوع بحث بنا رہتا ہے لیکن یہاں ''ماکان'' کی شکست اور امیر ابوجعفر کی فتح پر لکھے جانے والے قصیدہ کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ جس میں ابوجعفر کے صفات کا جیتا جاگتا نقشہ ہے اور وہ واقعات نگاری کا اعلیٰ نمونہ بن گیا ہے۔ یہ قصیدہ تاریخ سیستان سے اس نوٹ کے ساتھ ماخوذ ہے:

''پورا قصیدہ نقل کرنے کے بعد تاریخ سیستاں کا مولف لکھتا ہے:

'اور ہم نے یہ اشعار اس لیے درج کیے ہیں کہ جو انہیں پڑھے گا اس نے گویا ابوجعفر کو دیکھا ہوگا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ (رودکی) نے بیان کیا ہے۔''

رودکی کے بعد عنصری کے قصائد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ عنصری کا زیادہ کلام دستیاب نہیں لیکن جو کچھ موجود ہے اس میں اس دور کی تاریخ کے لیے کافی مواد موجود ہے''

اسی طرح منوچہری اور فرخی کے قصاید کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس کے دو قصائد بعنوان ''مراجعت سلطان از فتح سومنات'' او''از سفر سومنات وفتح آنجا و شکستن منات و رجعت سلطان'' کی گئی منظر نگاری وہ بھی ایسے ہولناک ماحول کی کہ:

''موسم بہت خراب تھا، راستہ پر خطر اور زمین پر خار تھی ایسا بیابان کہ دن رات کی طرح تاریک تھا کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ لوگ ڈراتے تھے کہ بیابان میں نہایت زہریلے دومنھے سانپ ہیں۔ مگر محمود نے کوئی پروانہ کی''

دراز تر زغم مُستمندِ سوختہ دل

کشیدہ تر ز شب دردمند خستہ جگر

سنائی کے قصائد کی اہمیت کو اس درجہ مسلم سمجھا گیا کہ انہیں قرآن کریم کی عارفانہ شرح سے تعبیر کیا گیا۔

''خود حکیم سنائی کے زمانے میں ان کے قصائد بے حد مقبول تھے اس کا ثبوت تفسیر میبدی سے فراہم ہوتا ہے۔ اس تفسیر میں آیات قرآنی کی عرفانی تشریح میں سنائی کے قصائد سے پچاسوں مقام پر استشہاد ہوا ہے۔

عروس حضرت قرآن نقاب آنگہ بر اندازد

کہ دارالملکِ ایمان را مجرد بیند از غوغا

عجب نبود گر از قرآن نصیبت نیست جز نقشی

کہ از خورشید جز گرمی نہ بیند چشم نابینا

سنائی کے معاصرین میں مسعودِ سعدِ سلمان کے قصائد کے لیے کئی نکات میں سے یہ دو نکات خصوصاً بیان کیے گئے ہیں۔

ا۔ ''اس کے قصیدے تاریخی واقعات سے پُر ہیں۔ اور بعض بعض امور تو ایسے ہیں جن کا واحد ماخذ مسعود سعد سلمان کا کلام ہے۔''

۲۔ مسعود سعد سلمان کی بدولت ''حبسیہ'' فارسی قصیدے کا ایک اہم حصہ قرار پایا۔ مسعود کے ان قصائد میں انسانی کردار کی بلندی قائم ہوئی۔ حبسیہ قصاید کی روایت کو خاقانی نے آگے بڑھایا لیکن اس کا قصیدۂ مدائن بقول نذیر صاحب:

''اس کے ایک قصیدے ہے سے جو مدائن سے گزرنے کے موقع پر لکھا گیا اور
جو اپنے ملک کی عظمت رفتہ کا دردناک مرثیہ ہے۔''

انوری قصیدہ گوئی کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے قصاید کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا گیا:

''اس نے قصیدہ گوئی کو انواع مضامین سے آراستہ کیا۔ اس کا کلام
اصطلاحات علمی، فلسفیانہ مضامین اور افکار دقیق سے پُر ہے۔

ایرانی قصیدہ نگاروں پر بحث کرتے ہوئے جب وہ ہندستان کی فضا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی پہلی نظر انتخاب عرفی پر ٹھہرتی ہے اور اس کی شاعری کے چند خصائص یہ بتائے گئے:

۱۔ شاعری میں فکری عناصر کا شمول

۲۔ شاعری کی بنیاد انسانی اقدار کی برتری پر

۳۔ قصیدوں میں مضمون آفرینی، نازک خیالی، افکار نو، تشبیہات بدیع، جدت طرز ادا کے اضافے سے ان کو نئی جہت سے آشنا کرنا۔

عرفی نے شاعری کو فلسفہ اور حکمت کے مضامین سے پر بار کر دیا تھا۔''

ایران میں جدید فارسی شاعری کے دور میں بھی قصیدہ نگار شاعروں کی کمی نہیں رہی اس دور میں آزادی خواہوں نے اپنے قصائد سے تحریک کا کام لیا ہے۔ نذیر صاحب نے اس طرف اشارے کیے ہیں:

''قصائد سے بڑے بڑے کام لے گئے ہیں۔ خصوصاً مشروطہ دور کے شعرا
نے پرشکوہ قصیدوں کے ذریعے عوام کے حقوق کی نشاندہی کی اور لوگوں کو
انقلاب کے لیے ابھارا۔ ملک الشعرا بہار کے قصائد ملکی و ملی مسائل کے
مآخذ کا کام کرتے ہیں۔

غرض کہ قصیدے کی ہر صنف سخن پر برتری ثابت کرنے، اس کی اہمیت اور افادیت کو باقی رکھنے کی تحریک سے قصیدہ نگاری کو نئی جلا ملی۔ اس مقالے کا نتیجہ پروفیسر صاحب کی ہی تحریر سے واضح کیا جارہا ہے:

''قصیدہ ہی وہ صنف سخن ہے جس میں علوم وفنون کا سب سے زیادہ اظہار
ملتا ہے۔ علم نجوم و ہیت، ریاضی و موسیقی، حیوان شناسی، علم طبقات الارض

وغیرہ کے مضامین کا بیان قصیدے میں مل جاتا ہے۔"

اس طرح پروفیسر نذیر احمد نے فارسی شاعری کی ایک روایتی مگر اہم صنف سخن پر قلم اٹھا کر اسے ناقدین کے غلط اعتراضات سے پاک کر کے نئے سرے سے قصاید کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔

سید احسن الظفر

پروفیسر نذیر احمد صاحب اور کچھ یادیں

حضرات! سیمینار کا موضوع ''۱۹۴۷ء کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد'' طویل مقالے کا مقتضی ہے جس کے لئے خاصی فرصت، صلاحیت اور نذیر صاحب مرحوم سے وابستگی درکار ہے۔ میرے خیال میں سیمینار میں موجود بعض حضرات خصوصیت سے پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب اور پروفیسر ریحانہ خاتون دونوں نذیر صاحب سے اپنی وابستگی کی بنا پر اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی پوزیشن میں ہیں۔ بلکہ پروفیسر ریحانہ خاتون نے تو ''شیخ الطائفہ پروفیسر نذیر احمد'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس میں یہ کام کافی حد تک انجام پاچکا ہے۔ اس لئے خاکسار نذیر صاحب مرحوم سے وابستہ کچھ یادوں کا ہی تذکرہ کرے گا۔

ہندوستان میں فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد صاحب مرحوم ایک طرح سے لازم ملزوم ہیں اور ان کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جگر مرادآبادی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

غرق جامِ شراب ہونا تھا
مست جامِ شراب خاک ہوئے

تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں نذیر صاحب نہ صرف مست جامِ کتاب تھے بلکہ غرق جامِ کتاب بھی تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کی ہر نشست و برخاست فارسی زبان وادب کی

تحقیق وتتبع اس کی لغوی نحوی اور صرفی موشگافیوں اور اس کی توسیع وترقی سے عبارت تھی۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ پروفیسر ریحانہ خاتون نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ان کے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالواسع کا کہنا ہے کہ ہم چار بھائی بہن امریکا میں مقیم ہیں وہاں سے بصد ہزار دقت چھٹیاں لے کر اور راہ کی صعوبتیں اٹھا کر والد صاحب سے ملنے آتے۔ اگر چہ پہنچنے پر نہایت خوش دلی اور گرم جوشی سے استقبال کرتے، گفتگو کرتے، خیر وعافیت دریافت کرتے اور عادت کے مطابق تھوڑی دیر بعد ان کو چھوڑ کر اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے، جبکہ وہ لوگ ان سے شکایت بھی کرتے تھے لیکن عادت کے موافق وہ جواب میں صرف ایک ہلکے سے تبسم سے کام چلا لیتے۔'' (شیخ الطائفہ پروفیسر نذیر احمد)

اس پر مجھے بیدل کا ایک شعر یاد آیا:

دریں زمانہ ز بس طبع دوں رواج گرفت
عنان کسب کمالات سوی نان گردید

بیدل کہتے ہیں اس دور میں طبعی دنائت اور پستی کا یہ عالم ہے کہ لوگ کمال اس لئے حاصل کرتے ہیں تاکہ روزی روٹی کمائیں۔ بیدل کا زمانہ ۱۶۴۴-۱۷۲۰ء کا ہے۔ غور کیجئے کہ ۱۷ویں صدی کے اواخر اور ۱۸ویں صدی کے اوائل یعنی آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل عام رجحان یہ تھا کہ کمال بذات خود مقصود نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ حصول کمال کا مقصد ملازمت کا حصول یا روزی روٹی کا انتظام تھا۔ آج کا دور جیسا کچھ ہے ہم آپ سب دیکھ رہے ہیں، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنے والوں کا مقصد صرف حصول ملازمت رہ گیا۔ ان کو علمی شغف سے کوئی سروکار نہیں۔ اس قحط الرجال کے دور میں نذیر صاحب مرحوم پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو جگر مرادآبادی کا درج بالا شعر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ان پر صادق آتا ہے:

مست جامِ کتاب ہی نہ تھے
غرق جامِ کتاب بھی تھے وہ

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ایک ہزار سے بھی زائد تحقیقی مقالے لکھے جو دنیا کے اہم ترین تحقیقی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ترتیب دیا ہوا دیوان مہندرس لاہوری ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ایک عرصہ تک کچھ دانشوروں کی مدد سے اعجاز خسروی مصنفہ امیر خسرو کے انگریزی ترجمہ میں بھی مصروف رہے جو امریکا سے شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، ایران، افغانستان اور امریکا کے تحقیقی رسائل میں فارسی و اردو زبان و ادب، لسانیات، تاریخ و تمدن، خطاطی وثقافت وموسیقی وغیرہ موضوعات پر اردو اور فارسی زبانوں میں نذیر صاحب مرحوم لگاتار لکھتے رہے اور مختلف رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ نذیر صاحب نے پاکستان، ایران، افغانستان، سعودی عرب، کویت، عراق، انگلینڈ، روس اور امریکا کے متعدد بار سفر کئے اور وہاں کی بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کر کے اپنے عالمانہ مقالات پیش کر کے داد حاصل کی۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے تاسیسی رکن تھے اور زندگی بھر اس کے ٹرسٹی رہے۔ ایک عرصہ تک اس ادارے کے سکریٹری کے عہدے پر بھی کام کرتے رہے۔ فارسی اردو کے تحقیقی وعلمی رسالے ''غالب'' کے بھی ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شعری تصنیف اور قدیم دکھنی اردو کی اہم دستاویز کتاب ''نورس'' کو متعدد مخطوطات کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا۔ قدیم فارسی فرہنگوں سے نذیر صاحب کی خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے فخر الدین مبارک شاہ کو اس کی غزلوں کے مرتب کردہ فرہنگ قواس ۱۹۷۴ء میں، حاجب خیرات دہلوی کی دستور الفاضل تہران سے اور بدر ابراہیم کی تالیف فرہنگ زفان گویا و جہان پویا کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ سے دو جلدوں میں شائع کی۔ فیروز شاہ تغلق کی فارسی فرہنگ لسانی شعراء ایران کلچر ہاؤس سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ وہ فارسی کے ایک بے نظیر عالم تھے۔ تحقیق کا جو کام بھی کرتے تھے اسے حرف آخر تک پہنچا دیتے تھے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب مرحوم سے غائبانہ تعارف تو پہلے سے حاصل تھا۔ مگر ان سے ملاقات کی ابتداء ۱۹۷۲ء سے ہوتی ہے۔ جب وہ ایم اے فارسی کا وائیوا لینے کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی تشریف لائے، اور شعبہ عربی کے اس وقت کے صدر صمدی صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کون سا شاعر آپ کو زیادہ پسند ہے۔ میں نے کہا اقبال، انھوں نے کہا ان کا کوئی شعر سنایئے، میں نے اقبال کا درج ذیل شعر سنایا:

لرد مغرب آں سراپا مکر وفن　　اہل دیں را داد تعلیم وطن

میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا مغرب کے مکار آقاؤں نے اہل دین کو جوایک خدا ایک رسول اور ایک کتاب کے نام پر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو سکتے تھے وطنیت کی تعلیم دے کر ان میں پھوٹ ڈال دی۔ انھوں نے پوچھا لفظ لرد کیا ہے؟ میں نے کہا یہ لفظ مجھے ڈکشنری میں نہیں ملا۔ مگر مولانا علی میاں نے اس کا ترجمہ مغرب کے مکار آقاؤں سے کیا ہے۔ انھوں نے کہا لفظ لرد اصل میں انگریزی لفظ لارڈ ہے۔ یہ پہلی ملاقات کی روداد ہے۔ پھر ۷۵-۱۹۷۴ء میں جب ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے میں شعبۂ فارسی میں مرزا بیدل پر کام کر رہا تھا، بعض ناسازگار حالات کی بنا پر علی گڑھ آیا، اور پروفیسر شمعون اسرائیلی مرحوم کے ایک بھائی کے توسط سے جو میرے احباب میں تھے، نذیر صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر حاضر ہوا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے کچھ لکھ پڑھ رہے تھے، علیک سلیک اور کچھ گفتگو کے بعد عرض کیا میں آپ کی نگرانی میں بیدل پر کام کرنا چاہتا ہوں، شرط یہ ہے کہ اسکالرشپ منظور ہو جائے، انھوں نے فرمایا بھئی اسکالرشپ کے لئے تو ہم انٹرنل اسٹوڈنٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس وقت وہ غالباً ڈین فیکلٹی آف آرٹس تھے۔ اس کے بعد میں لکھنؤ واپس آ گیا، یہاں بھی یو جی سی اسکالرشپ منظور ہو گیا تھا اور استاد مرحوم ولی الحق انصاری صاحب کی نگرانی میں بیدل پر کام کرنے لگا۔ ۱۹۷۷ء میں میرا مقالہ مکمل ہوا۔ اتفاق سے اس کے ایک ممتحن نذیر صاحب ہی تھے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں بڑے حوصلہ افزا کلمات لکھے، ان کے چند کلمات یہاں اس لئے لکھتا ہوں تا کہ معلوم ہو کہ وہ صلاحیتوں کے کتنے قدرداں تھے۔

Bedil is the most significant Persian poet of India of 18th century who has great impact not only on the later Perian poets of Afghanistan and Transoxiana and in these tow regions he earned greatest populaity . But being a difficult and proficeint poet very few scholars attemted to deal exhaustively with his life and achievement . It is satisfying that Mr. Ahsanuzzafar , a young scholar of Persian chose to undertake a serious study about this poet and produced a work of high standard .

Mr Zafar has pieced together all the available biographical notes about this poet and supplemented them with the information gleand froam the poet,s writings and in his attempt , the writer has shown ability in sifting and

comparing the data and examining the real worth of the savnat. The author deserves congratulations for tackling a dificult subject with conspicuos success.

یعنی بیدل چونکہ فارسی کا ایک عظیم مشکل پسند شاعر سمجھا جاتا ہے، اس لئے بہت کم لوگوں نے اس کے حالات اور تصنیفات کا جامع مطالعہ کیا ہے۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ احسن الظفر صاحب نے اس شاعر کے سنجیدہ مطالعہ کی ذمہ داری سنبھالی اور ایک گراں قدر اور معیاری مقالہ سپرد قلم کیا۔ شاعر کی زندگی اور کلام سے متعلق دستیاب تمام مواد کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور ان کا شاعر کی خود اپنی تصانیف سے حاصل ہونے والی معلومات سے موازنہ کیا۔ بیدل سے متعلق جملہ مواد کو اکٹھا کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کر کے صحیح نتائج پر پہنچنے ارو بیدل کی حقیقی ادبی حیثیت متعین کرنے میں مصنف نے غیر معمولی کاوش اور صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ایک مشکل موضوع کو نہایت کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ اس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پھر پی ایچ ڈی کے وائیوا کیلئے بھی وہی تشریف لائے۔ کہنے لگے اگر آپ نے فارسی میں مجھے خط نہ لکھا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ یہ مقالہ آپ نے کسی سے لکھوایا ہے۔ قصہ یہ تھا کہ میں نے اپنا مقالہ فارسی میں لکھا تھا۔ اس سے پہلے لوگ فارسی زبان وادب کا مقالہ یا اردو میں لکھتے تھے یا انگریزی میں۔ مقالہ نویسی سے بہت پہلے مشہور اساتذہ سے خط وکتابت کے ذریعہ رہنمائی حاصل کرنی چاہی تھی۔ انہیں میں پروفیسر نذیر صاحب بھی تھے۔ اسی خط کا حوالہ دے کر انھوں نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اس تذکرہ سے مقصود اپنی خودستائی نہیں ہے۔ بلکہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ان کی حوصلہ افزائی ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد ان کی شفقتیں میرے حال پر بڑھ گئیں۔ استاد مرحوم پروفیسر انصاری صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر کی پوسٹ پر انٹرویو کے لئے آپ حاضر نہیں ہوئے، ایکسپرٹ کی حیثیت سے نذیر صاحب تشریف لائے تھے اور کہہ رہے تھے اگر احسن الظفر ہوتے تو میں انہیں کے لئے سفارش کرتا۔ اس پوسٹ کے لئے درخواست میں نے بھی دی تھی مگر کسی ضرورت سے وطن چلا گیا تھا اور میرے غائبانہ میں انٹرویو ہوا۔ ۱۹۷۸ء جولائی میں جب شعبۂ فارسی میں لکچرر کی پوسٹ پر میرا تقرر ہوا تو نذیر صاحب مرحوم فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی دعوت پر ایک لیکچر دینے لکھنؤ تشریف لائے۔ اس میں میں بھی شریک تھا اور انصاری صاحب مرحوم کی معیت میں ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو رہی

۔ کچھ ہی دنوں بعد امیر خسرو سوسائٹی آف امریکا کی طرف سے اعجاز خسروی کے انگریزی ترجمہ کا ایک پروجیکٹ ان کے حوالے ہوا۔ انھوں نے مترجمین کی ایک ٹیم بنائی۔ اعجاز خسروی کی تیسری جلد کا ترجمہ پروفیسر انصاری اور میرے حوالے ہوا۔ میں ترجمہ کر کے انصاری صاحب کو دکھاتا اور وہ اس کی تصحیح کر کے نذیر صاحب کو بھیجتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دو میٹنگ میں جوان کے دولت کدہ علی گڑھ میں ہوئی، شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ ان ملاقاتوں میں ان کی علمی بحثوں اور موشگافیوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس قحط الرجال کے دور میں کم از کم ایک مرجع ایسا ہے جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد آل انڈیا پرشین ٹیچرس کی کانفرنسوں میں اور دیگر سیمناروں میں خصوصیت سے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیمنار اور ایران کلچر ہاؤس کی طرف سے منعقد ہونے والے فارسی بازآموزی کے جلسوں میں ان سے ملاقاتیں رہیں اور ان کے لیکچر سے استفادہ کا موقع ملتا رہا۔

☆☆☆

علیم اشرف خان
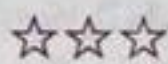
۱۹۴۷ عیسوی کے بعد فارسی زبان و ادب اور پروفیسر نذیر احمد

عہدِ وسطیٰ سے فارسی زبان وادب کی تاریخ نہایت درخشندہ اور شاندار رہی ہے جو موجودہ مقالے کے حدود سے خارج ہے اور صرف ۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔ کسی بھی فارسی زبان وادب کے طالب علم کو یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب جب اپنی سرکاری اور درباری سرپرستی سے محروم ہوئی اور انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کرکے فارسی زبان وادب کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کا عملی کام انجام دیا تو اِس کے باعث فارسی کی جگہ دھیرے دھیرے اردو زبان نے لے لی۔ یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے کہ اردو دوستوں نے بھی انگریزوں کی سرپرستی میں یک گونہ معاندانہ رویّہ اپنانا شروع کیا جس کے نقصان اور اثرات کے ہم اکیسویں صدی میں شاہد ہیں کیونکہ اردو کے کلاسیکی شعرا کے کلام کے ادراک وتفہیم کیلئے فارسی کا علم لازمی ہے مگر کیا کریں کہ حالات نے یکسر ایسا رُخ اختیار کرلیا جس کا نقصان فارسی زبان وادب کو ہوا۔ ۱۹۴۷ کے بعد ہمارے مشاہیر، محققین، اُدبا، شعرا اور مصنّفین فارسی کی فہرست خاصی مختصر ہوگئی اور یہ بھی درست ہے کہ جو خلا فارسی کی پوزیشن کو ختم کرنے کے بعد پیدا ہوا اُسے اردو زبان وادب نے پاٹنے کی ایک ناکام کوشش ضرور کی۔

جب ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی (Lord Wellesley) نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی اور میر امن دہلوی، شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، مظہر علی خان، لالولال، بنی نارائن جہان اور میرزا علی لطف کو بحیثیت مترجم اور مدرّس کے اس کالج میں ملازمت دی تو یہ اقرار کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اِن بزرگوں کے ہاتھوں حدائق البلاغہ، دبستانِ مذاہب اور مسیر طالبی جیسی اہم کتابیں ترجمہ ہوئی مگر اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ انگریزوں نے فارسی کی جگہ اردو کو دے کر اپنی سیاسی برتری اور فارسی دشمنی جگ ظاہر کردی تھی۔ ایک اور اہم واقعہ جو ۱۷۸۰ء میں رونما ہوا وہ وارن ہیسٹنگز کے ذریعے مدرسہ عالیہ کا قیام ہے جہاں عربی زبان و ادب کی تدریس کیلئے اسوقت کے نامور عربی علما میں عبدالرحیم گورکھپوری اور مؤید بُرہان اور غالب کے ناقد احمد علی کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اِسی مدرسہ عالیہ کے پرنسپل ہندوستان کی آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد مشہور و معروف فارسی اور عربی کے استاد مولوی سعید احمد اکبرآبادی کو مقرر کیا گیا نیز ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی بنیاد رکھی جس میں جان گلرسٹ، ڈاکٹر اشپرنگر اور فرانسیس گلاڈون جیسے شرق شناس حضرات نے نہایت عالمانہ کام انجام دئے۔ یہ وہی ادارہ ہے جس کا نہایت مشروح کیٹلاگ روسی مستشرق ولادمیر ایوانو (Wiladmir Ivonow) نے تیار کیا تھا۔

فارسی جسے عہدِ وسطیٰ میں Lingua Franca کی پوزیشن حاصل تھی وہ ملک کی آزادی سے قبل ہی ۲۰ ویں صدی میں ایک نامہ نویس صنف سمجھی جانے لگی اور انگریزی و اردو نے اس کی جگہ لے لی جس کے باعث فارسی کی اہمیت اور قدردانی میں کمی واقع ہوئی لیکن یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہے کہ جب تقسیمِ ہند کا پُر فتن دور گذر گیا تو ہمارے جن محققین، ناقدین، دانشوروں اور ادب دوستوں نے اِس زبان کی آبیاری کا بیڑہ اٹھایا اُن میں سے چند، پروفیسر حسن عسکری، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر تاراچند، حبیب الرحمٰن خان شروانی اور پروفیسر عبدالقادر معروف و مشہور ہیں۔

اِسی فہرست میں پروفیسر نذیر احمد کی فارسی خدمات کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے گویا فارسی اب بھی اسی مقام پر جاگزین ہے جو مرتبہ اسے عہدِ وسطیٰ میں حاصل تھا۔ پروفیسر نذیر صاحب کی تحقیقات آج تک محققین کیلئے مشعل راہ ہیں اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اُس سے استفادہ کرتی

رہیں گی۔ اُن کی جملہ تصانیف اور نگارشات پر ایک جداگانہ سیمینار کا انعقاد ہوسکتا ہے مگر فی الحال آپ کی ایک مختصر مگر وقیع تالیف 'فارسی قصیدہ نگاری' پر اظہارِ خیال مقصود ہے جس میں نذیر صاحب کے دقیق علمی نکات، اُن کی دقتِ نظر عمیق مطالعہ، محققانہ فہم وذکاوت اور تجزیاتی وناقدانہ روش قابلِ تحسین ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کی علمی اور محققانہ بصیرت اور فتوحات کا جو مُرقّع یہاں موضوع بحث ہے وہ محض ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۹۱ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے جس میں ہندوستانی محققین اور نقادوں پر ایک عالمانہ تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے تحریر کیا ہے:

> ''ہندوستانی نقادوں اور محققوں نے فارسی قصیدہ گوئی کے مطالعے کا حق ادا نہیں کیا بلکہ اکثر اِس صنف کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کے ذمہ دار ہوئے ہیں میری اپنی نظر میں فارسی قصدہ گوئی فارسی شاعری کا طرّہٗ امتیاز ہے''۔ (ص:۷)

نذیر صاحب کا یہ بیان اسوقت اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے جب وہ اسی کتاب میں آگے تحریر فرماتے ہیں:

> ''اخلاقی، مذہبی، عارفانہ، تاریخی، قومی اور سیاسی موضوعات پر شاعر کے بے لاگ اظہارِ خیال کیلئے قصیدے سے بہتر کوئی صنف نہیں اور حق بات یہ ہے کہ فارسی قصیدے موضوعات ومضامین کے تنوع کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے اسلئے مجھے اُن حضرات سے بنیادی اختلاف ہے جو قصیدہ گوئی کو محض بھٹئی سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ فارسی قصیدہ گو شعرا کی عظمت کے قائل نہیں ہیں۔ شبلی نعمانی جیسے نقاد نے بھی فارسی قصیدہ سرائی کے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا''۔
> (ص:۷و۸)

پروفیسر نذیر احمد صرف محقق نہیں تھے بلکہ وہ ایک شفیق استاد تھے جو ہمہ وقت اپنی نگارشات میں اپنے طلبہ کی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے اس طرح کی معمولات بھی سپردِ قلم کرتے تھے جو اُن کے طلبہ کی رہنمائی کر سکے مثال کیلئے منوچہری کے تعارف اور اُس کے کلام پر کلّیہ ہے وہ

تحریر کرتے ہیں:

''منوچہری دامغانی فارسی کا وہ بے بدل شاعر ہے جس نے مناظر طبیعی کی نقاشی نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں کی ہے۔ کسی فارسی شاعر کے یہاں مناظرِ طبیعت کا بیان اتنی تفصیلات کے ساتھ نہیں ہوا ہے سینکڑوں ایسے پھولوں، چڑیوں، نغموں اور دوسری متعلق اشیاء کا نام اور خصوصیت اس کے کلام میں موجود ہے جن میں سے اکثر فارسی میں بجز لغات کے کہیں اور نہ ملیں گے۔ یہی ایک وصف ہے جو اس کو فارسی کے بیشتر شاعروں سے ممتاز کرتا ہے بطور نمونہ مشتے از خروار نقل کیے جاتے ہیں:

نو بہار آمد و آورد گُل و یاسمنا
باغ ہمچو تبت و راغ بسانِ عدنا
کبک ناقوس زن و شارک سنتو زن است
فاختہ نای زن و بط شدہ طنبور زنا

اِن اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ منوچہری نے مناظرِ قدرت کے اوصاف کبھی کبھی علامتی طور پر Symbolic انداز میں نادر و بدیع تشبیہات کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ شاعری کا یہ وصف اُس کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ (صص: ۲۵، ۲۶ اور ۲۹)

ظاہر ہے نذیر صاحب کی رائے اُن کی مستقل محنت، مرتب مطالعہ اور قصایدِ منوچہری کو بنظر غایت پڑھنے اور فکری تجزیے کو چند سطروں میں منتقل کرنے کی اعلیٰ مثال ہے۔

حکیم سنائی غزنوی کا فارسی قصیدہ نگاروں مس اہم مقام ہے اُس نے اخلاقیات اور عرفان وتصوّف کو قصائد کا موضوع بنا کر جو قصیدے تحریر کیے ہیں وہ اُس کے پختہ ہُنر شاعری کا بین ثبوت ہیں جس پر پروفیسر نذیر صاحب نے بہت مدلّل انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''اب میں ایک ایسے شاعر کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جس کا کلام علم و حکمت، عرفان وتصوف اور مذہب واخلاق کا زبردست خزانہ ہے یہ

شاعر حکیم سنائی غزنوی ہے جس کی مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ، مثنوی مولانا روم کا مآخذ رہی ہے لیکن خود حکیم سنائی کے زمانے میں اُن کے قصائد بے حد مقبول تھے اس کا ثبوت تفسیر میبدی سے فراہم ہوتا ہے اس تفسیر میں آیاتِ قرآنی کی عرفانی تشریح میں سنائی کے قصائد سے پچاسوں مقام پر استشہاد ہوا ہے۔ سنائی کے قصائد قرآنِ کریم کی عارفانہ شرح ہیں۔ سنائی کے فکر وفن کے اندازے کیلئے دو شعر بطور مثال پیش ہیں:

دلا تاکی درین منزل فریبِ این و آن بینی
یکی زین چاہ ظلمانی برون شو تا جہان بینی

یا:

مسلمانان مسلمانان مسلمانی مسلمانی
ازین آئین بی دینان پشیمانی پشیمانی

حکیم سنائی کے بیشتر کلام کا انداز عارفانہ وحکیمانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر صرف سنائی کے قصیدے کا ٹھیک طور پر مطالعہ کرلیا جائے تو فارسی قصیدہ نگاری کی بابت جو عام غلط فہمی ہے وہ رفع ہوسکتی ہے"۔
(ص: ۳۴و۳۵)

سنائی کے بعد خاقانی نے بھی فارسی قصیدہ نگاری کی روایت کو مزید تقویت بخشی اور قصائد کے حوالے سے بہت سے ایسے کام انجام دیے جس کی توقع قصیدہ گو شاعر سے نہیں کی جاتی، ایک موقع پر خاقانی نے ایوانِ مدائن کے عنوان سے قصیدہ لکھا جس پر ایک عالمانہ اور وقیع تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر نذیر صاحب رقمطراز ہیں:

"قطع نظر اُن قصائد کے جو خاقانی کی قوّتِ اندیشہ ومہارت خُلقِ معانی وابتکارِ مضامین تازہ کے مظہر ہیں اور یہ وہ قصائد ہیں جو سنائی کی پیروی میں حکمت وموعظت کے مضامین سے پُر ہیں۔ اُس کے ایک قصیدے سے جو مدائن سے گزرنے کے موقع پر لکھا گیا اور جو اپنے مُلک کی عظمتِ رفتہ کا دردناک مرثیہ ہے چند اشعار درج

کرنے کی اجازت چاہوں گا:

ھان! ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ھان
ایوانِ مدائن را آئینہ عبرت دان
یک رہ ز لبِ دجلہ منزل بہ مدائن کن
از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن ران"

(ص:۳۹)

نذیر صاحب نے اپنی اس کتاب میں فارسی قصیدہ نگاری کے کئی سو سالہ سفر کو نہایت اختصار سے بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"قصیدہ اہم ترین صنف سخن ہے اس کی وجہ سے فارسی شاعری کا دامن وسیع ہوا ہے اور بطور نتیجہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱- اس صنف سخن کی وجہ سے فارسی شاعری کے موضوعات میں کافی اضافہ ہوا ہے سیاسی، سماجی، قومی، ملّی، اخلاقی، عرفانی اور تاریخی ہر طرح کے مسائل قصیدے میں بیان ہوئے ہیں فارسی شاعری اسی صنف کی وجہ سے نہایت وسیع ہوگئی ہے۔

۲- تاریخی واقعات کے بیان کیلئے اس صنف سے بہت کام لیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قصیدہ نگار شاعروں کا کلام تاریخی دستاویز ہے اُن میں مبالغہ ضرور ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی نہایت کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ان قصیدوں میں ایسے واقعات درج ہوجاتے ہیں جن کا تاریخ احاطہ نہیں کر پاتی۔ فرخی سیستانی اور عنصری کے قصائد محمود غزنوی کے دور کے واقعات کے نہایت اہم مآخذ ہیں۔

۳- خصوصاً دورِ مشروطہ کے شعرا نے پرشکوہ قصیدوں کے ذریعے عوام کے حقوق کی نشاندہی کی اور لوگوں کو انقلاب کیلئے اُبھارا، ملک الشعراء بہار کے قصائد ملکی اور ملی مسائل کے مآخذ کا کام کرتے

ہیں۔

۴۔ شاعری کی یہی صنف ہے جس میں شعراء اپنی فنی، علمی اور ادبی صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں۔ قصیدہ ہی وہ صنفِ سخن ہے جس میں علوم وفنون کا سب سے زیادہ اظہار ملتا ہے۔ علمِ نجوم و ہیئت، ریاضی و موسیقی، حیوان شناسی، علم طبقات الارض وغیرہ کے مضامین کا بیان قصیدے میں مل جاتا ہے"۔ (صص:۵۶و۶۷)

پروفیسر نذیر صاحب کا ذاتی کینوس نہایت وسیع وعریض ہے اسلئے وہ اپنے علمی کاموں میں طلبا، اساتذہ، مؤرخین اور محققین کیلئے کچھ نہ کچھ مثبت اشارے ضرور کردیتے ہیں جو مستقبل قریب میں نئی تحقیقات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں یا مزید تحقیق کے دروازے وا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے اس بیان سے ان کی تحقیق کے علاوہ ایک کہنہ مشق استاد اور رہبر اور رہنما کا کام بھی ہو جاتا ہے۔ جس میں فارسی اور تاریخ میں مزید تحقیق کے عنوانات ملتے ہیں نیز انہوں نے فارسی ادبیات میں قصائد کی اہمیت اور ان میں درج گھن گرج اور طمطراق کا خلاصہ کرتے ہوئے بطور نتیجہ اہم نکات سپردِ قلم کیے ہیں:

۱) مذکورہ بالا علوم کا نتیجہ ہے کہ فارسی شاعری اصطلاحات علمی وفنی سے پُر بار ہوگئی ہے علاوہ بریں ایسے الفاظ وفقرات بھی قصیدے کا جزو لاینفک ہوگئے ہیں جو شان وشکوہ، جوش وخروش، دبدبہ و ہیبت پیدا کرنے میں ممد ہوتے تھے۔ ہزاروں نئی تراکیب بنائی گئیں جن سے فارسی ادب کا دامن گرانبار ہوگیا۔ میرے خیال میں اگر صرف قصائد کے الفاظ، فقرات اور ترکیبات وغیرہ کی فہرست مرتب کی جائے تو ان سے ایک ضخیم فرہنگ تیار ہو جائے گی۔

۲) فارسی شعر وادب میں قصائد کا حصّہ سب سے زیادہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ فارسی شعرا میں بیشتر بڑے شعرا قصیدہ نگار ہوئے ہیں اُن میں رودکی، فرخی، عسجدی، عنصری، ازرقی، ناصر خسرو،

مسعود سعد سلمان، مختاری غزنوی، امیر مُعزّی، سنائی غزنوی، سوزنی، رشید وطواط، عبدالواسع جبلی، اثیر، مجیر بیلقانی، ظہیر فاریابی، خاقانی شروانی، جمال الدّین اصفہانی، رضی الدّین نیشاپوری اور کمال الدّین اسمٰعیل وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اگر اِن شعرا کے کلام کو نظر انداز کر دیا جائے تو فارسی شاعری کا خزانہ خالی ہو جائے گا۔

۳) قصائد میں جتنا تنوع ہے اتنا کسی اور صنف میں نہیں، فارسی شعرا کی ایک بیاض 'مونس الاحرار' ہے اس کا مؤلف بدر الدّین جاجرمی ہے جس نے ۷۴۱ ہجری میں یہ مجموعہ مرتب کیا اس کی پہلی جلد تو محض قصائد پر مشتمل ہے اور دوسری جلد کا بھی بیشتر حصّہ قصائد سے تعلّق رکھتا ہے''۔ (ص: ۵۸)

نذیر صاحب نے اپنی اس ۸۸ صفحات کی تالیف کا عصارہ آخری صفحے میں بطور خلاصہ بیان کر دیا ہے جو ان کی وسیع معلومات، مخطوطات سے آ گہی، دواوین شعرا پر گہری نظر، محققانہ اصول وضوابط اور استادانہ و قائدانہ روایتوں پر دال ہے وہ تحریر کرتے ہیں:

''اس گزارش کا مقصد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ فارسی قصیدہ نگاری کوئی بیکاری کا مشغلہ نہ تھا نہ ہی اس کا مقصد محض ممدوحین کی مبالغہ آمیز تعریف تھا۔ ممدوح کی مدح ایک ضمنی چیز ہے دراصل اِس صنف کے ذریعے عظیم شعرا نے اپنی توانائی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے بیان پر صرف کی۔ قصائد میں شخصی کردار کی بلندی کے ساتھ ساتھ اجتماعی و انفرادی زندگی کی ضرورت و مقاصد، ملکی وملّی ضرورتیں بھرپور انداز میں بیان ہوئی ہیں چنانچہ میرے اس نقطۂ نظر کی تصدیق اس مقالے میں مندرج اشعار سے ہو جائے گی اور چونکہ خود انفرادی شعرا کے قصائد موردِ بحث تھے اس لئے اشعار نسبتاً زیادہ درج ہو گئے ہیں۔ اشعار زیادہ درج کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قارئین کیلئے شعرا کے

دواوین حاصل کرنا مشکل ہے یہ اشعار مقالے کو خود کفیل بنا دیتے
ہیں۔ فارسی قصیدہ نگاری مقبول ترین صنفِ سخن تھی عظیم شعرا نے اس
صنف کو اپنے خیال کا وسیلہ بنایا اُن کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا اُن کی
صلاحیتیں محض ممدوح کی مدح پر صرف ہو جائیں۔ قصیدہ نگاری کی
مقبولیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ فارسی کی جتنی قدیم بیاضیں اور مجموعے
پائے جاتے ہیں اُن میں قصائد کا حصہ جزوِ غالب کی حیثیت رکھتا ہے
اور فارسی قصیدہ گو شعرا کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر فارسی شاعری
سے قصائد خارج کر دیئے جائیں تو اُس کا دامن خالی ہو جائے اور اگر
مؤرخِ ادب فارسی کے قصیدہ گو شعرا کو نظر انداز کر دے تو اُس کی تاریخ
میں کچھ بھی دلکشی باقی نہیں رہے گی''۔ (ص:۵۹)

بطور خلاصہ پروفیسر نذیر احمد کے علمی و ادبی کارناموں کو دیکھ کر اور اُن کا غایر مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد صاحب نے جو کام انجام دیئے ہیں وہ کسی ایک فردِ واحد سے تکمیل پانا امرِ محال ہے اور بے ساختہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اُن کے علمی و ادبی کام دراصل انجمن اور اداروں کی مجموعی محنت و کاوش کا نتیجہ ہوگا۔ اِسی پر 'کارنامۂ نذیر' میں استاد گرامی پروفیسر شریف حسین صاحب نے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے:

''پروفیسر نذیر صاحب در حقیقت فارسی دنیا کی آبرو اور فارسی زبان و
ادب پر کام کرنے والے دانشوروں کی توجّہ کا مرکز ہیں۔ آپ کا شمار
بجا طور پر فارسی دنیا کے مفاخر میں کیا جاتا ہے۔ ایران اور ہندوستان
کے تقریباً تمام علمی و ادبی مراکز نے آپ کی علمی حقیقت کا
اقرار کیا ہے اور آپ کی علمی بصیرت کو سراہا ہے اور مختلف انداز سے
آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اس طرح اس حقیقت کا اقرار
کیا ہے کہ آپ کی شخصیت فارسی دنیا میں باعثِ فخر ہے۔ (پیش لفظ،
کانارمۂ نذیر)

کتابیات

۱- کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، اسلامک وَنڈرس بیورو، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء۔

۲- فارسی قصیدہ نگاری، پروفیسر نذیر احمد (پیش لفظ، پروفیسر کبیر احمد جائیسی، ڈائریکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ، علیگڑھ، سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ علومِ اسلامیہ، ۳۳، لیتھوکلر پرنٹرز، اچل تال، علیگڑھ، ۱۹۹۱ء۔

۳- پروفیسر نذیر احمد درنظرِ دانشمندان، پروفیسر ماریہ بلقیس، شعبۂ فارسی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، اسلامِک وَنڈرس بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء۔

قمر غفار

آہ! پروفیسر نذیر احمد

(زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالبؔ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے باوقار شعبۂ فارسی کو کس کی نظر لگی کہ علم و ادب و دانشمندی کے خوبصورت مستحکم ستون یکے بعد دیگرے گرتے ہی چلے گئے۔ آسمان ادب کے درخشاں ستارے سب دیکھتے ہی دیکھتے معدوم ہو گئے۔ پروفیسر سید نبی ہادی بھی داغ مفارقت دے ہی گئے یقین نہیں آتا ع

کسے رفیق کریں کس سے دلبری چاہیں

اور شعبہ فارسی کے قد آور سرو سمن سے لہلاتے چمن زار کی سنہری تاریخ کا تقریباً ایک باب اختتام کو پہنچا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ایوان غالب کا یہ دو روزہ سمینار ماضی کی طرف جھانکنے کا راستہ دکھا رہا ہے۔ دیکھئے

جناب جگ بیتی تو سب کہتے ہیں آپ بیتی کہنے کا موقعہ اگر اتفاق سے مل جائے تو فبہا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایم .اے. میں داخلے کے لئے شعبہ فارسی اپنے والد محترم کے ساتھ پہنچی۔ میرے ساتھ داخلے میں مسئلہ یہ تھا کہ بی.اے. (آنرز) کا ایک پیپر مجھے کلیر کرنا تھا اور جب تک یہ امتحان وقوع پذیر ہوتا ایم.اے. میں داخلہ کا وقت نکل جاتا۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ پروفیسر نذیر احمد صاحب مرحوم کی مدد درکار تھی۔ اس سے قبل میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں جب پہونچی تو موصوف اپنے آفس میں بہت تپاک سے ملے اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا، ضرور داخلہ ملے گا پریشانی کیا ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے دھیمی آواز میں اپنا مسئلہ بتایا۔ مسکرائے اور بڑی شفقت سے گویا ہوئے ''ارے تم پہلے آؤ تو پھر سب مشکل حل ہو جائے گی'' مجھے وہ پس منظر، وہ لمحہ آج بھی پوری توانائی کے ساتھ یوں یاد ہے کہ جیسے ابھی کوئی مجھے محبت سے بلا رہا ہو۔ میری پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔

اسی منظر نامہ کا دوسرا اسین، میرا ایم۔اے۔ میں جز وقتی داخلہ ہو گیا۔ پیپر کلیئر کرنے کا وقت بڑھتا جاتا ہے، جز وقتی داخلہ کے ختم ہونے کا سے آ گیا۔ اس نزاکت کو پروفیسر نذیر احمد صاحب بھولے نہیں، ایک خط لکھا، مجھے دیا اور کہا یہ رجسٹرار صاحب کے پاس لے جاؤ۔ میرا نام لکھا دیکھیں گے تو تمہیں اندر جانے کی اجازت جلد مل جائے گی۔ میں ان کا پروانہ لیکے آگے بڑھی، دروازہ تک پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے شفقت آمیز آواز آئی: یہاں آؤ میری بات سنو! دیکھو یہ مت کہنا نذیر صاحب نے مجھے بھیجا ہے بلکہ یوں کہنا پروفیسر نذیر احمد صاحب صدر شعبہ نے مجھے آپ کے پاس مدد کیلئے بھیجا ہے۔ بہر حال صاحب بالکل ویسے ہی ہوا۔ رجسٹرار صاحب نے کہا، ایک ہفتہ بعد میرے پاس آنا۔ ایک ہفتہ گذر گیا، داخلہ کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ بغیر اجازت دو تین چکر رجسٹرار صاحب کے پاس لگائے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کی توپ تو ساتھ تھی ہی ایک دن ذرا جھلائے انداز میں رجسٹرار صاحب جمال قدوائی صاحب (ان دنوں رجسٹرار تھے سبکدوشی کا وقت آن لگا تھا) سے کہا سر میں جب آتی ہوں آپ بھول جاتے ہیں، اور پچھلی کہانی سنانے کو کہتے ہیں۔ بڑی معصومیت سے کہا، بی بی آپ برقعہ میں ہوتی ہیں، ہم کیسے پہچانیں (میں اس زمانے میں بہت سخت پردہ کرتی تھی) میں نے یہ کہتے ہوئے نقاب پلٹی کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ سے کیا پردہ۔ نقاب کا الٹنا کونسی مبارک گھڑی تھی کہ خدا کی رحمت سے اور پروفیسر نذیر احمد صاحب

کی باوقار اور بابرکت شخصیت سے قانون ہی بدل گئے۔ لیجئے صاحب مسئلہ حل ہوا۔ میں بھی خوش پروفیسر موصوف بھی شاداں۔ بہت محبت سے فرمایا آپ دل لگا کر محنت سے پڑھو۔ اب پڑھائی کی مشقت درپیش تھی، پردہ سخت، شعبہ کی لائبریری میں کیسے بیٹھتی؟ پروفیسر نبی ہادی صاحب نے اپنے کمرے کی سہولت فراہم کی، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد منع کر دیا۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کو گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر چیز کا علم رہتا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا تو مجھے بلا کر حکم دیا کہ دیکھو میرے کمرے کی کونے والی کرسی جہاں ایک چھوٹی سی میز بھی رکھی ہے وہاں بیٹھ کر پڑھا کرو، جب ان کی کلاس ہوتی تو اٹھ کر چلی جاتی۔ وہ اس پر ناراض ہوئے اور کہا ''تم اپنا کام کرتی رہا کرو''۔ میں ایم۔اے۔فائنل کے بچوں کو کیا پڑھا رہا ہوں غور سے سنو۔ کام آئے گا۔

مشکل مضامین پروفیسر صاحب کے پاس رہتے تھے۔ لسانیات اور اوستا ملا جلا پیپر ریزلٹ آیا 67 نمبر ملے تھے۔ کہنے لگے ''پڑھتی تو تم بہت تھیں نمبر کم کیسے ہیں؟'' خاموش رہی، اب میں کیا کہتی نمبر بھی تو آپ ہی سختی کے ساتھ دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ایم۔اے۔کے پہلے سال میں امتیازی نمبر حاصل ہوئے۔ سال تمام ہوا نوبت ششماہی امتحان کی پہنچی۔ ہمیں فارسی بولنی کہاں آتی تھی بس ایک ہی سوال کے جواب میں کہا بلی۔ پروفیسر نبی ہادی صاحب بھی ساتھ میں بیٹھے تھے ان سے شکایت کی، اس کو فارسی بولنا کیوں نہیں سکھایا۔ انہوں نے بھی سفارش لگائی 'بلی' تو کہہ دیا ہے۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گئے۔ پھر امیر خسرو کے کلام کی خصوصیات کے بارے میں پوچھا۔ دیگر خصائص کے ساتھ میں نے کہا خسرو کے ہاں شوخی بہت ہے۔ ایک دم بولے، ہائیں! شوخی شرارت تو بچے کرتے ہیں خسرو کہاں؟ میں بھی اپنی بات پر اڑی رہی۔ کہا اچھا کوئی شعر سناؤ، میں نے سنا دیا۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر
بروی عاشقان شرمندہ باشی

وضاحت بھی کر دی۔ جواب پسند آیا شاباشی دی۔ Viva کس نے لیا۔ پوچھا فارسی جدید کے جو افسانے پڑھے کسی ایک کا خلاصہ بتاؤ، اردو ہی میں سہی، میں اس سوال کے لئے تیار نہیں پھر بھی ایک افسانہ 'مرگ مادر' جس کے غمناک انجام کا مجھ پر بہت اثر تھا، یاد آ گیا۔ سنا دیا، پھر ان کی شفقت سے حوصلہ پا کر میں نے اپنی بقراطیت دکھائی۔ کہا سر، فکر بھی افسانہ نگار کی تھی اور قلم بھی اس ہی کا تھا، ایسا

دردناک انجام کیوں دکھایا رونا آ گیا، اپنا کھنکتا ہوا بلند قہقہہ لگایا اور بولے ہاں بی بی کاغذ بھی اس ہی کا تھا اور دوات بھی اس ہی کی تھی۔ کہا کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں دل پر اثر نہیں لیتے۔

اس ہی Viva-Voce سے جڑی اگلی کڑی جوان کے حسن اخلاق سے جڑی وسعت قلب ونظر کی غماز پرانی روایتوں اور تہذیب کا روشن رخ ہے۔ نواب کنور عمار خاں صاحب جو یونیورسٹی کے ٹرزرار بھی تھے کچھ یاد نہیں آتا، شاید حیاتی رکن، ان کی بیٹی نکہت کی شادی تھی جس کو سب لوگ نکی کہتے ہیں۔ یونیورسٹی کی اہم شخصیات وہاں موجود تھیں۔ اتفاقاً میرے والد صاحب بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب، پروفیسر نبی ہادی صاحب یہ لوگ میرے والد صاحب کے پاس بیٹھے۔ والد صاحب سے میری تعریف کی۔ ششماہی امتحان کے پس منظر میں گویا ہوئے غفار صاحب آپ کی لڑکی کا کیا زور بیان، ایکسپریشن اور اکسپلینشن ہے، ماشاء اللہ ترقی کرے گی۔ والد صاحب خاموش رہے، پروفیسر نبی ہادی صاحب نے بعد میں کہا آپ کے والد صاحب خوشی سے لال ہو گئے اور میں شرمایا کیونکہ وہ امتحان میں ساتھ بیٹھے تھے۔ بہر حال یہ ہوتی تھی اساتذہ کی شان، یوں ہمتیں بڑھاتے تھے۔ ہم نے بھی ان کی امیدوں پر پانی نہیں پھیرا، پوری فیکلٹی میں ٹاپ کیا۔

پھر کچھ بدگمانیوں کے کالے بادل آئے، جلد ہی چھٹ بھی گئے۔ .Ph. D کے درمیان میری بعض دشواریوں کا ان کو علم ہوا۔ میرے پاس مستقیم صاحب (آفس انچارج) کے ہاتھ پیغام بھجوایا، پریشان نہ ہو، میں ہر طرح کی مدد کروں گا۔

کہاں تک دردِ سر دوں، یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے کہ ''دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن'' ہر یاد ''تماشا دامن دل می کشد کہ جا اینجاست'' کے مصداق ہے۔ یوں بھی جس طرح محبت کے فسانوں کا کوئی عنوان نہیں ہوتا، کے مصداق یادیں ماضی سے جڑی جیسی بھی ہوں، دل کا دامن کہاں چھوڑتی ہیں۔ ان ہی کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ نئے حوصلوں اور سرگرمیوں کے سایہ میں خود انسان دنیا چھوڑ دیتا ہے۔ اور

بدن سے گردِ مسافت اتارنے کے لئے
سفر تمام ہوا غسل دے رہے ہیں لوگ

سید محمد اسد علی خورشید

فارسی تحقیق و تنقید میں پروفیسر نذیر احمد کے امتیازات

استعمار اور مابعد استعمار کے دور کے ہندوستان میں فارسی کے تخلیقی ادب کو فطری، عصری ، سیاسی اور فرہنگی تقاضوں کی بنیاد پر جوزک پہنچی اس پر نوحہ گری کی شدت کو کم کرنے کے لئے یہ احساس کافی ہے کہ تحقیقی و تدقیقی اور تنقیدی لباس پہن کر عروس فارسی اسی دور میں منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی اور اسی دور میں علمائے فارسی خواہ وہ برصغیر ہند و پاک سے تعلق رکھتے ہوں خواہ معاصر ایران کے بھی نے ان ہی میدانوں میں اپنا رائیت علم وفن افراشتہ کیا اور اسی زمین میں تخم ریزیوں کی مساعیاں کرتے ہوئے فارسی ادب کو دنیائے ادب کے جدید تقاضوں سے روشناس کرانے میں اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔

بیسویں صدی کے فارسی زبان و ادب کے حوالے سے راقم مقالہ نے علمائے فن و ادب کی مساعیوں کے مطالعے کے لئے انہیں تین طبقات میں منقسم کرتے ہوئے پیش نظر صدی کے نصف آخر کے فارسی زبان و ادب کے اجمالی اور چند سطور پر مشتمل مباحث کے ذیل میں فارسی تحقیق و تنقید میں پروفیسر نذیر احمد کے امتیازات کی تلاش و جستجو میں ایک ادنیٰ سی کاوش کی ہے۔

بیسویں صدی کے علمائے فارسی کے سنین وفات کے اعتبار سے تین طبقات کی تعیین اس

طور پر کی گئی ہے کہ طبقۂ اوّل میں وہ علماء شامل ہوئے ہیں جو ۱۹۴۷ء سے قبل وفات پا چکے تھے، جبکہ طبقۂ دوّم میں انہیں شامل کیا گیا ہے جن کا سال وفات استقلال ہند کے بعد سے لے کر ۱۹۸۰ء کے درمیان ہے اور طبقۂ سوّم میں وہ محققین و ناقدین شامل ہیں جنہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد اس دارفانی سے رخت سفر باندھا۔

اس طرح طبقۂ اول میں محمد حسین آزاد (م ۱۹۱۰ء)، الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء)، شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء)، پروفیسر محمد شفیع (م ۱۹۴۲ء)، پروفیسر محمد اقبال (م ۱۹۴۶ء)، پروفیسر محمود شیرانی (۱۹۴۶ء)، اور پروفیسر عبدالغنی جبکہ طبقۂ دوم میں سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء)، پروفیسر سید ہادی حسن (م ۱۹۶۳ء)، پروفیسر نجیب اشرف ندوی (م ۱۹۶۸ء)، ڈاکٹر محمد اسحٰق (م ۱۹۶۹ء)، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (م ۱۹۷۳ء)، پروفیسر وحید مرزا (م ۱۹۷۶ء) اور طبقۂ سوم میں امتیاز علی خاں عرشی (م ۱۹۸۰ء)، پروفیسر قاضی عبدالودود (م ۱۹۸۴ء)، پروفیسر نورالحسن انصاری (م ۱۹۸۷ء)، سید صباح الدین عبدالرحمٰن (م ۱۹۸۷ء)، پروفیسر سید حسن (م ۱۹۸۸ء)، پروفیسر نذیر احمد (م ۲۰۰۸ء)، پروفیسر امیر حسن عابدی (م ۲۰۱۱ء)، پروفیسر ولی الحق انصاری (م ۲۰۱۴ء) پروفیسر وارث کرمانی اور پروفیسر نبی ہادی (م ۲۰۱۶ء) شامل کئے گئے ہیں۔

مذکورہ تینوں طبقات کے محققین و منتقدین میں دو قسم کے علماء ہیں۔ ایک قسم تو ان افراد کی ہے جن کے ذہن و فکر کی نشو و نما مغرب کی کارگاہ میں مستشرقین کے زیر سایہ ہوئی، جبکہ دوسری قسم ان افراد کی ہے جن کی ذہنی بالیدگی اور فکر و نظر کی تربیت خود اسی برصغیر ہند و پاک یا سرزمین ایران کی مرہون منت ہے۔ اور قسم اول میں پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر عبدالغنی، پروفیسر سید ہادی حسن، پروفیسر وحید مرزا اور پروفیسر قاضی عبدالودود جیسے نابغۂ عصر شامل ہیں جبکہ قسم دوم میں محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر محمد اسحٰق، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر نورالحسن انصاری، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر سید حسن، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر ولی الحق انصاری، پروفیسر وارث کرمانی اور پروفیسر نبی ہادی جیسے محققین و منتقدین اور مفاخر فارسی شامل ہیں۔

طبقۂ اول کے محققین و ناقدین پر گفتگو تو اس سمینار کے دائرے سے باہر ہے لیکن کم از کم

خراج تحسین کے طور پر طبقۂ دوم وسوم کے صاحبان فضل وکمال کے علمی وتحقیقی چند قابل ذکر کارناموں کے اجمالاً ذکر کے بعد اصل موضوع پر گفتگو مناسب ہوگی۔

مذکورہ دونوں طبقوں کے علما وفضلا اس برصغیر کے وہ نامور فرزند ہیں جنہوں نے تحقیق و تدوین متون میں دیوان قاسم کاہی، دیوان فلکی، دیوان ہمایوں بادشاہ، رقعات عالمگیری، مثنوی نہ سپہر اور خزائن الفتوح اور نقد وانتقاد میں خیام، پرشین نیویگیشن، تجارتِ ہندو، طبابت ہندو، اخلاق ہندو، سخنوران ایران در عصر حاضر، شعر فارسی معاصر، چہار شاعرۂ برجستۂ ایران، تذکار سلف، سمن زار، امیر خسرو احوال وآثار، ایولیوشن آف غالبس پرشین پوئٹری، ڈریمس فارگوٹن، بیدل، مغلوں کے ملک الشعراء، طالب آملی، اے ڈکشنری آف انڈو پرشین لٹریچر، ہسٹری آف انڈو پرشین لٹریچر وغیرہ جیسے علمی وتحقیقی کارناموں سے فارسی ادب کو ثروتمند کیا۔

سنین وفات کے اعتبار سے منقسم ان طبقات میں سے طبقۂ سوم میں جاگزیں پروفیسر نذیر احمد کا شمار درجۂ اول کے محققین وناقدین میں ہوتا ہے جن کا ذہنی وفکری عروج وارتقاء کسی خمخانۂ مغرب کا مرہون منت نہیں بلکہ سراسر مشرق کا ہی فیضان نظر ہے۔ اس مشرقی کرشمہ و فیضان نے پروفیسر نذیر احمد کی عرفانِ ادب اور سلوکِ تحقیق وتنقید میں ایسی تربیت کی کہ انہیں خانقاہ تحقیق وتنقید کا مرشد کامل بنا دیا اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے اس عظیم محقق و منتقد کے علمی کارنامے کسی زاویۂ نگاہ سے بھی دونوں طبقات ماقبل کے علماء وفضلائے ادب فارسی سے کمتر وکہتر نہیں بلکہ معاصر ایران کے مشاہیر محققین وناقدین کے کارناموں سے چشمکیں کرتے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر امیر حسن عابدی جو پروفیسر نذیر احمد کے دیرینہ دوست رہے تھے اور فارسی ادب کی دنیا میں ایک مرتبۂ شاخ پر متمکن ہیں، نذیر احمد کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

> ''...ایک زمانہ تھا کہ شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، پروفیسر ہادی حسن، پروفیسر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر وحید مرزا، پروفیسر مسعود حسن رضوی، پروفیسر زبیر صدیقی، پروفیسر عبدالمعید خاں، پروفیسر نظام الدین، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اسحٰق وغیرہ کی خدمت

میں حاضر ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، لیکن ان کی سیرت اور کارنامے ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ مگر ان سب بزرگوں کو ملا کر اگر میں پروفیسر نذیر احمد صاحب سے مقابلہ کروں تو میں بلا تأمل کہہ سکتا ہوں کہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے آپ کے علمی کارنامے ان سب پر بھاری ہیں۔"

(پروفیسر نذیر احمد در نظر دانشمندان؛ ص ۱۹)

آگے چل کر پروفیسر عابدی مرحوم راقم ہیں؛

"ایران میں علامہ قزوینی پہلے شخص تھے جنھوں نے تحقیق کا راستہ دکھلایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، پروفیسر محمد معین، دہخدا، ڈاکٹر خانلری وغیرہ جیسے صاحبان علم پیدا ہوئے جنھوں نے دقت نظر اور جزئیات کی چھان بین پر زور دیا۔ ہندوستان میں حافظ محمود شیرانی پہلے شخص تھے جنھوں نے پرانے روایتی انداز کو بدلا اور تحقیق و تدوین کا راستہ دکھلایا۔ ان کے روحانی شاگرد ڈاکٹر صاحب (یعنی پروفیسر نذیر احمد) نے اس انداز کو اپنایا۔ قاضی عبدالودود ان سب کے مداح اور غیر معمولی علمی شخصیت کے حامل تھے۔ نیز انہوں نے ہمیشہ پروفیسر نذیر احمد صاحب کے کاموں کی ستائش کی۔ مجھے بھی قاضی صاحب کی صحبت میں بارہا استفادہ کا موقع ملا ہے۔ ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے بھی نذیر صاحب کے تحقیقی مقالات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔"

(ایضاً؛ ص ۲۰)

پروفیسر عابدی کے بیان کے مطابق اپنے سفر ایران سے قبل ہی پروفیسر نذیر احمد فارسی ادب کے دنیائے تحقیق میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ فارسی ادب میں تحقیق و تنقید کی ابتداء کا سہرا ایران میں علامۂ قزوینی اور ہندوستان میں علامۂ شیرانی کے سر ہے اور بلا تأمل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو عروج و کمال پر پہنچانے کا افتخار مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد کو حاصل ہے۔

فارسی تحقیق وتصحیح متون میں پروفیسر نذیر احمد کے کارنامے بڑے وقیع اور پرارزش ہیں جس کے ثبوت میں ان کے مصححہ دیوان سراجی، دیوان عمید لونکی، مکاتیب سنائی اور دیوان حافظ کے نام لئے جاسکتے ہیں جو محکِ اعتبار و استناد پر سرہ اور خالص ہیں، اور فارسی ادب کی دنیا میں نذیر احمد کو قد آور تشخص کے زمرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ پروفیسر نذیر نے تحقیق میں متون کو مہمات سے جانتے ہوئے نہایت جانفشانی، عرق ریزی اور جگر کاوی کے ساتھ ان متون کی تصحیح و تدقیق کے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں اور تصرفات و تحریفات کی نشاندہی نہایت بالغ نظری کے ساتھ کر کے سرہ و ناسرہ کو متفاوت کر دیا ہے۔

تصحیح متون ادبی کے علاوہ پروفیسر نذیر احمد کے اہم کارناموں میں لسان الشعراء، فرہنگ قوّاس، مدار الافاضل، فرہنگ زفان گویا وغیرہ جیسی فرہنگوں کی تلاش وجستجو اور لغات کی تحقیق و تدقیق ہے جس کی بنا پر انہیں فارسی کے معتبر و مستند لغت شناسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان فرہنگوں کی تحقیق و تدقیق اور لغات کی چھان پھٹک میں پروفیسر نذیر نے کیسی کیسی جانفشانیاں کی ہیں، اہل علم پر عموماً اور ان کے حلقۂ تلمذ کے افراد پر خصوصاً ظاہر و باہر ہیں اور ان کا ذکر تطویل لا طائل ہوگا۔

علمی و تحقیقی مقالات جس کثرت سے پروفیسر نذیر نے تحریر کئے ہیں وہ ان کے علمی تبحر اور فکر و نظر کے عمق و وسعت کی بیّن دلیل ہیں۔ ذیل میں پروفیسر نذیر احمد کے بعض علمی و تحقیقی مقالات پر کچھ گفتگو اور ان کے پس منظر میں ان کے عالمانہ امتیازات کا ایک نقش کھینچنے کی کچھ کوشش کی جاتی ہے۔

''اردو فارسی کی ایک تاریخی تلمیح۔ ایاز'' کے عنوان سے پروفیسر نذیر احمد کا مقالہ ان کی علمی بصیرت اور تعمق نظر کا نمونہ ہے، جس میں بعض مستند تاریخی اشاروں کی بنیاد پر انہوں نے ایاز کی حیات کا ایک نقش اپنی عالمانہ بصیرت سے کھینچا ہے۔ محمود غزنوی اور اس کے جانشینان اول و پنجم یعنی مسعود اور فرخزاد کے عہد میں ابوالنجم ایاز بن اویماق یا ایماق کے ظہور سے لے کر عروج اور وفات تک کے احوال تاریخ بیہقی، دیوان فرخی، زین الاخبار، طبقات ناصری، دیوان منوچہری، تاریخ بناکتی اور مجمل فصیحی جیسے اصلی منابع اور مقالات شیرانی و شعر العجم جیسے ثانوی مآخذ سے مرتب کر دیئے ہیں۔

یہ مقالہ مجموعی طور پر چار ذیلی عناوین؛ دور محمود، عہد مسعود غزنوی، عہد فرخزاد بن مسعود اور محمود وایاز کی داستان عشق میں منقسم ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کی تحقیق کے مطابق محمود غزنوی کے عہد میں ایاز اگرچہ مشہور ہو چکا تھا لیکن سیاسی امور میں اس کا کچھ دخل پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا البتہ اس کی موجودگی کے شواہد ہیں۔ پروفیسر ممدوح نے نہایت محققانہ انداز میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ محمود کے دربار سے انتساب کے وقت ایاز اپنے عنفوان شباب کے دور میں تھا اور اس امر کی تحقیق میں ایاز کی مدح میں ۴۲۱ھ میں فرخی کے کہے گئے ایک قصیدے کو بنیاد بناتے ہوئے اسی سے اس نکتے کا استنباط کیا ہے کہ ایاز کا سال پیدائش ۳۹۲ھ کے آس پاس رہا ہوگا اور محمود کی تخت نشینی ۳۸۷ھ کے وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ۳۹۲ھ کے اردگرد پیدا ہونے والا ایاز اٹھارہ۔بیس سال کی عمر میں دربار محمود سے وابستہ ہوا ہو کیونکہ اس کی وابستگی کے شواہد تو تاریخ بیہقی جیسے ماخذ سے متیقن ہیں۔

ایاز کے سن ولادت کے قیاس میں پروفیسر نذیر نے فرخی کے جس شعر کو استنباط امر میں شاہد بنایا ہے وہ؛

یکی گوید کہ آن سرویست بر کوہ
یکی گوید گل تازہ ست پربار

ہے اور فرخی کے ایاز کو 'سرو' اور 'گل تازہ' قرار دینے سے اس کی عمر تیس سال کے حدود میں رکھ کر اپنے قیاس کی عمارت تعمیر کی ہے اور اس طرح فردوسی وایاز کے مشہور واقعے متعلق بہ ملاقات اور فردوسی کی عدم توجہی اور فردوسی کے ایاز کی تعریف میں کہی گئی رباعی اور شاہنامہ کا صلۂ موعود نہ ملنے کی صورت میں ہجویہ اشعار کا سر بمہر لفافہ ایاز کو سونپے جانے کے تمام مشہور و متداول روایات کو غیر مستند اور مفروضہ قرار دیا ہے۔

پروفیسر نذیر کی تحقیق کے مطابق سلطان مسعود غزنوی کو تخت نشین کرنے اور اس کے سریرآرا بھائی امیر محمد کو تخت سے بے دخل کرنے میں ایاز نے اپنی کم عمری کے باوجود اعلیٰ سیاسی تدبر اور گہری حکمت عملی سے کام لیا۔ جس کے صلے میں مسعود کے دربار میں اسے اعزاز و اکرام حاصل رہا۔ جبکہ تاریخ بیہقی کے ایک ذکر، جس سے سلطان مسعود کی نگاہ میں ایاز کی غیر

ناتجربہ کاری اور عدم پختگی کی بات مترشح ہوتی ہے فاضل محقق کو حیرت واستعجاب بھی ہے لیکن اس امر میں وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں اور یہ مسئلہ لاینحل رہا ہے۔ جس پر کام کا موقع ہے۔

عہد فرخزاد بن مسعود میں ایاز کے تعلق سے پروفیسر نذیر احمد کی فکر رسا اور ذہن متجسس کو کوئی اہم بات یا قابل ذکر حیثیت نظر نہیں آتی اور بالآخر اسی غزنوی سلطان کے عہد حکومت میں ۴۴۹ھ میں ایاز کی وفات ہوجاتی ہے۔

اس مقالے کے آخری ذیلی عنوان یعنی ''محمود اور ایاز کی داستان عشق'' کے ضمن میں پروفیسر نذیر، محمود کے ایاز سے اس خاص جذبۂ محبت کے قائل نظر آتے ہیں جو فارسی وارد وادب میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ جبکہ علامہ شبلی اس زمانے کے ایسے غیر مشروع اوضاع وروش معاشرہ پر اپنی شعرالعجم میں متعجب ہیں اور محمود کی مدح میں کہے گئے قصائد میں حسن ایاز کے برملا اظہار اور اس پر محمود کے اظہار پسندیدگی پر انگشت بدنداں ہیں۔ جبکہ علامہ شیرانی شبلی کے اس خیال کی اپنی تنقید شعرالعجم میں تردید کرتے ہیں کہ وہ قصائد جس میں حسن ایاز کا ذکر ہے وہ محمود کی مدح میں ہیں، بلکہ اسے مدح سرائی مسعود قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے کے تمدنی اوضاع میں ایسے سوقیانہ اور پست عاطفۂ التفات کی موجودگی کے ثبوت میں پروفیسر نذیر احمد تاریخ سیستان کے حوالے سے یعقوب لیث کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اپنا محققانہ فیصلہ یہ سناتے ہیں کہ:

> ''اس دور میں معاشرے میں اخلاقی
> پستی کی علامتیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔
> اس پر نہ حیرت کرنا چاہیئے اور نہ اس
> کے دفاع کی کوشش، غلامی بڑی
> لعنت ہے اور ہزاروں معائب کی
> بنیاد بھی۔''

(مقالات نذیر؛ غالب انسٹی ٹیوٹ؛ ص ۹۳)

تدین وتقویٰ اور اسلامی تاریخ میں بت شکن کے لقب سے ملقب اس ہیرو کی ایاز پرستی اور ان کے حسن وعشق کی مشہور داستانوں صحت وصداقت کی، پروفیسر نذیر احمد اپنی تحقیقات کی روشنی میں تائید وتوثیق کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مقالے میں پروفیسر موصوف نے شعرائے

فارسی کے یہاں تلمیح وتشبیہ اور استعارے کی مستحکم صورت اختیار کر چکے محمود و ایاز کے قصہ عشق کی اساتید سخن کے موجود نمونوں کے ذکر کے بعد اپنے مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے آخر میں تحریر کرتے ہیں کہ؛

"...ایاز کی زندگی کا ایک مختصر ساخا کہ چند ماٰخذ کی بنیاد پر یہاں پیش کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دقیق مطالعے سے نئے ماخذ معلوم ہونگے اور ان کی بنیاد پر ایک اہم سیاسی شخصیت کی اصل تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آئے گی۔

ایاز کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ غزنوی دور میں محل کے غلاموں کا دستہ اس وقت کے فوجی نظام میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ امر کافی اہمیت رکھتا ہے۔ رہا ادب کا طالب علم، تو اس کا مطمح نظر تو ایاز کی داستان عشق ہے۔ یہ داستان اصلی ہو یا فرضی اس کے لئے (یعنی ادب کے طالب علم کے لئے) دونوں برابر ہیں، لیکن تاریخ حقیقی اور فرضی داستان کے درمیان حد فاصل کھینچتی ہے۔ اس کا صحیح ادراک ادب و تاریخ دونوں کے طالب علم کے لئے دلچسپی کا یکساں سامان رکھتا ہے۔"

(ایضاً؛ ص ۹۴)

اس مقالے اور اس جیسے معتد بہ مقالات سے پروفیسر نذیر احمد کی تحقیقی و علمی وجاہت اور عالمانہ و فاضلانہ جلالت کا ایک دلکشا شبستاں تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ موضوع کے انتخاب، مآخذ و منابع کی تلاش اور اس میں متعلقہ موضوع سے متعلق تفحص و تجسس، بعض رائج و مشہور داستانوں کے رد و ابطال اور بعض کی تصحیح و تصدیق اور نتائج کے استخراج کے ساتھ ساتھ کہیں مبہم اور کہیں برملا محققانہ فیصلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نذیر احمد کی جودت طبع اور فکر رسا کس طرح ادب کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تھی اور ان کا محققانہ مقیاس و معیار کیسی فاضلانہ بصیرت سے مملو تھا۔

ایسے ہی پروفیسر نذیر احمد کے دوسرے مقالات مثلاً "رواں۔ تلفظ اور معنی" کا مطالعہ بھی یہ باور کراتا ہے کہ صرف ایک لفظ "رَواں" یا "رُواں" کے تلفظ کی تعیین میں نذیر احمد

کے پر تجسس ذہن نے کیسی کیسی کاوشیں کی ہیں اور چار حروف پر مشتمل اس لفظ کے حرف اول کی حرکت کے تعین کے لئے ان کی عالمانہ بصیرت نے فرہنگ اسدی طوسی، فرہنگ قواس، صحاح الفرس، معیار جمالی، دستور الافاضل، اداۃ الفضلا، زفان گویا، بحر الفضائل، شرف نامہ، تحفۃ السعادۃ، مؤید الفضلا، فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس، فرہنگ رشیدی، برہان قاطع، سراج اللغۃ، غیاث اللغات، فرہنگ نظام، فرہنگ معین اور لغت نامۂ دھخدا جیسی پانچویں صدی ہجری سے لے کر پندرہویں صدی ہجری تک کی بیس فرہنگوں کے عمیق مطالعے اور لفظ رواں کے معنی وشواہد کی چھان پھٹک کے بعد دس صدیوں پر محیط اس لفظ کے تلفظ کی داستان رقم کرتے ہوئے اپنا یہ محققانہ فیصلہ سنادیا کہ دونوں حرکات کے ساتھ اس لفظ کا تلفظ درست ہے۔ ہم جیسے معمولی طلبائے فارسی تو ایک دو فرہنگوں کے حوالے سے نتیجہ گیری کر لینے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن پروفیسر نذیر احمد کے غیر معمولی ذہن اور فکر بدیع کے تجسس کو ایک چشمے سے سیرابی نہیں ہوئی تو دس صدیوں پر محیط فرہنگوں کے سرچشموں میں اپنے مقصود کی تلاش میں شناوری کرتے کرتے بالآخر گوہر مدعا تلاش کر کے تحقیق کے میدان میں اپنی جولانی طبع کا سکہ جما دیا اور ایک لفظ کے معنی و تلفظ کی ایک ہزار سالہ داستان لکھ ڈالی۔

غرض پروفیسر نذیر احمد کے تحقیقی مقالات ہوں یا تنقیدی، تصحیح متون کی ریاضتیں ہوں یا قدیم فرہنگوں کی تدوین کے مجاہدات، تخریج و تعلیق کی کرشمہ سازیاں ہوں یا منابع و مصادر سے انہار مقصود کی کاوشیں ہر جگہ ان کا تیشۂ طباع و تجسس فرہاد وار ساری عمر اس طرح مشغول عمل نظر آتا ہے کہ جس کی نظیر اب مفقود نظر آتی ہے اور اس ہیچمد اں کے دل سے فقط یہ نکلتا ہے کہ:

ع   خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

محمود فیاض ہاشمی

1947ء کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے فارسی طلباء سے خطاب فرماتے ہوئے ایک پیغام دیا تھا جو کچھ اس طرح ہے: ''فارسی نے ہندوستان کی تہذیب کے ہر گوشہ کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی مثال دنیا کی شاید کوئی دوسری زبان نہ پیش کر سکے، لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان میں فارسی کی تعلیم جس طرح شروع ہوئی اُس میں ہندوستان پر اس کے اثرات پر زور نہیں دیا تھا، بلکہ فارسی اس لئے پڑھائی جاتی تھی کہ ہم ایران کو سمجھیں، لیکن یہ نقطۂ نظر جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج رہا اس نے فارسی کی تعلیم کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس نقطۂ نظر کو بدلنے کی شدید ضرورت ہے، اس لیے سب سے پہلے ہمارے اساتذہ وطالب علموں کی توجہ کا مرکز یہ اُمور ہونے چاہیں:

(1) فارسی زبان وادب اوراس کی اہمیت: اس میں یہ اُمور پیش نظر رہیں:

(الف) اخلاقی ادب کے لحاظ سے فارسی کا مرتبہ۔

(ب) غزل کی شاعری اوراس کی غیر معمولی اہمیت۔

(ج) قصیدہ نگاری کے بنیادی مقاصد اوراس کے اثرات

(د) رزمیہ شاعری کے میدان میں فارسی شاید دوسری زبان ہوگی جس میں اس قسم کی

شاعری ہوئی ہے۔

(2) فارسی کا میدان ادب سے زیادہ تہذیب اور تاریخ ہے، اس سلسلے میں یہ اُمور سامنے آنے چاہئیں۔

(الف) تاریخ نگاری میں فارسی کے اثرات۔

(ب) فارسی اور مشرق کا علم و ہنر اس میں ان مخطوطات کا ضرور ذکر ہونا چاہیے جو Illustrate (شبیہ کشی) ہوئی ہوں، اس لحاظ سے دنیا کے کم ہی ادب ایسے ہیں جن میں اس امر کی طرف توجہ ہوئی۔ فارسی کی ہزاروں نظم و نثر کی کتابیں مصوروں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں اور اس طرح کے کئی ہزار مخطوطے اب بھی دنیا کے کتابخانوں اور میوزیم کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

(ج) فارسی اور خطاطی: خطاطی کا فن فارسی کے ذریعہ بہتر ترقی یافتہ ہوا، خصوصاً نستعلیق اور اس سے متعلق دوسرے ذیلی خطوط فارسی کی ہی دین ہیں۔ یہ موضوع بھی ہمارے مطالعے کا اہم جزو ہونے چاہئیں۔

(د) کتبیہ شناسی اور باستان شناسی میں فارسی کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ موضوعات خاصے وسیع ہیں جن کا صحیح مطالعہ فارسی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

جن اُمور کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، ان کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کریں۔ صرف شعر و شاعری سے کام نہیں چل سکتا اور اس کا انجام سب نے دیکھ لیا کہ فارسی جو دنیا کی پہلی بین الاقوامی زبان تھی اور جس کا حلقۂ اثر مشرقی یورپ سے لے کر برما تک پوری طرح نمایاں تھا، اور جس کے نقوش دنیا کے سارے کتابخانوں اور میوزیموں میں اب بھی موجود ہیں کس طرح انحطاط پذیر ہوئی۔ ان نقوش کی شناخت فارسی اساتذہ و طلبا کے ہی ذریعے ممکن ہے۔ لیکن ابھی یہ اساتذہ اور طلباء اس طرح مجہز نہیں ہیں کہ وہ اتنے بڑے کام کو انجام دے سکیں۔ غرض سب سے جو ضروری چیز ہے وہ ہے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنا اور ساتھ ہی ایسے نصاب کی تیاری جس سے ہمارے اساتذہ فارسی زبان کے تہ در تہ اثرات ملکی اور اور بین الاقوامی سطح پر نمایاں کرسکیں۔ یہ سب اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم اپنے طریقہ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی کریں اور اس تبدیلی کے لئے شاید ہمارے اساتذہ جلدی ہی تیار نہ ہوں، اس لئے

میرے نزدیک اس وقت فارسی اساتذ پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

آدمی در عالم خاکی نمی آید بہ دست　　　عالمی دیگر بباید ساخت وز نو آدمی

شاید میری باتیں عام پسند نہ ہوں لیکن اگر عرفیؔ کا یہ شعر سامنے ہو تو میری گفتگو کے جواز کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کمیابی　　　حدیٰ را تیز ترمی خواہ چو محمل را گران بینی

اقتباس ختم (کارنامۂ نذیر، ریحانہ خاتون، 1990ء، دہلی)

آج غالب انسٹی ٹیوٹ میں یہ دو روزہ سیمینار جو کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف میں منعقد کیا گیا، دراصل یہ سیمینار ہمارے بزرگوں کی زندگی بھر کی کوشوں اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے علمی وادبی وقار کا اعتراف اور شکرانہ ہے۔ جو کہ ہماری نسل کی اخلاقی علمی ذمہ داری ہے۔

19 ویں اور 20 ویں صدی دنیا میں بڑی افراتفری اور تبدیلیوں کی صدیاں گزر رہی ہیں، خصوصاً ہندوستان میں جو اہم واقعات رونما ہوئے اور جس طرح سے سماجی، سیاسی اور ثقافتی مناظر بدلے تاریخ میں اس طرح کی مثال کم ملتی ہیں۔ انگریز تجارت کے بہانے اس ملک پر قابض ہوئے اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے انھوں نے ہر طرح کے حربے استعمال کئے۔ ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کے مضبوط رشتوں کو برباد کرنے کی ہر طرح کوشش کی، جس کا براہِ راست نشانہ بنی فارسی زبان۔ شاہ عالم سے دیوانی حاصل کرتے وقت وعدہ کیا تھا کہ فارسی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل رہے گی، مگر اپنے مکر وفریب کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے فارسی زبان پر ہی سب سے پہلے حملہ کیا۔

انگریزوں کی ہند دشمنی کا دَور ختم ہوا تو ہندوستان ایک بار پھر افتر تفری اور مذہبی تعصب کا شکار ہوا۔ سیاسی اقتدار کی ہوس نے معاشرہ کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ملک بکھر گیا، جس کی وجہ سے سب سے زیادہ مسلمان متاثر ہوئے۔ بڑے بڑے خاندان بکھر گئے۔ ہمارے دانشور، علماء اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے تتر بتر ہو گئے۔ انگریزوں کی کوشش یہ رہی کہ ہمیں اپنے ماضی سے جدا کر دیا جائے اور اگر ماضی کی یاد آئے تو ایک شکست خوردہ قوم ہونے کا احساس پیدا ہو۔ ہمارے اسلاف کی بزرگی اور ان کی خوبیوں کو نظر انداز کیا جائے اور اگر کسی بات کا ذکر کیا جائے تو وہ ہو اُن کی

کمزوریوں اور خامیوں کا۔

ملک کی تقسیم کے بعد عزت اور جان بچانے کی فکر میں بڑے بڑے ڈھیر ہو گئے۔ ہم سلام کرتے ہیں اپنے ان بزرگوں کو جن کی بدولت ہندوستان میں اس قوم نے اپنی وراثت اور ثقافت سے بہت زیادہ الگ نہیں ہونے دیا۔ اور اس طرح ہزار سالہ درخشاں اور شاندار علمی وادبی روایات کی پروردہ تہذیب کے تانے بانے کو باندھے رکھا۔ اس سلسلے کی ایک اور بہت اہم کڑی ہیں ہمارے نذیر صاحب۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے ہندوستان میں فارسی زبان وادب میں اپنی قائدانہ تحقیق کے ذریعے ہندوستانی فارسی ادب کو ایک وقار بخشا۔ ہندوستانی فارسی زبان وادب کی شاندار روایت امیر خسرو سے شبلی نعمانی اور پھر حافظ محمود شیرانی اور ہمارے زمانے تک امیر حسن عابدی، نذیر احمد اور قاضی عبدالودود جیسے دانشور اور محقق اس کے علمبردار رہے۔ نذیر احمد صاحب نے اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں سے ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء کی بازیافت کی۔ درحقیقت نذیر احمد صاحب کو قدیم، گمنام اور نایاب مخطوطات کی دریافت کا عجیب وغریب ملکہ حاصل تھا۔ جس کی سب سے بڑی طاقت ان کا مطالعہ اور حافظہ تھا۔ اسی خداداد صلاحیت کی وجہ سے حافظ شیرانی کے دیوان کا قدیم ترین نسخہ دریافت کر کے ایران کے دانشوروں کو حیران کر دیا۔

دیوانِ حافظ کا یہ نسخہ ایران میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے اور ایرانی علمی حلقہ میں مقبول ہے۔ ہندوستانی فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ حقیقت میں آپ کا مرتبہ دیوانِ حافظ، حافظ شناسی کی ایک نئی جہت کا آغاز ہے۔ سنائی غزنوی گرچہ فارسی صوفیانہ شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ اس پر بہت سے کام ہو چکے تھے، مگر اس کے خطوط کی بازیابی نے اس ضمن میں نئی حقیقتوں کو اُجاگر کیا۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر ان کے ہم عصر معتبر حضرات نے اپنی عالمانہ آراء کا اظہار فرمایا ہے اور بھی بہت کچھ اس ضمن میں کیا جانا باقی ہے۔ فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں نذیر صاحب ایک فردِ واحد نہیں بلکہ ایک مکتب فکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کے زیر سایہ فارسی زبان وادب کی تحقیق پروان چڑھی۔ اس موقعہ پر آپ کے علمی وادبی کارناموں پر تفصیلی بات تو نہیں کی جا سکتی۔ البتہ فارسی زبان وادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے اور یہی ہمارا مقصد بھی ہے جو کہ باعث فخر ہے۔ دور کا

سبھی ایک تعلق ہے۔

1977ء میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی جو ابھی ایک نوخیز حسینہ کی حیثیت رکھتی تھی، وہاں پر بنیاد فرہنگ ایران کے تعاون سے ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی گئی اور یہاں پر ہی انجمن استادانِ فارسی ہند عالم وجود میں آئی۔ اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ پروفیسر نذیر احمد صاحب سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

اسی زمانے میں آپ کو دہلی سے عجلت میں واپس علی گڑھ جانا پڑا کیونکہ آپ کی اہلیہ داغِ مفارقت دے کر اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد بار بار آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ 1979ء میں دہلی یونیورسٹی میں ایم فل. کورس کا آغاز ہوا، اس کورس کا تقاضہ تھا کہ تحقیق کس طرح کی جائے؟ اور اُصولِ تحقیق کیا ہیں؟ اس کا فارسی زبان و ادب کے تعلق سے کس طرح مطالعہ کیا جائے اور اس کا با قاعدہ امتحان بھی دینا تھا۔ راقم کے لئے یہ ایک بڑا خوشگوار اور فخریہ لمحہ تھا کہ اس خصوصی پرچہ کے لئے استاد محترم نذیر صاحب سے شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی نے درخواست کی اور آپ نے اس سلسلے میں شعبہ میں تشریف لا کر با قاعدہ اپنے عالمانہ انداز میں اُصولِ تحقیق اور فارسی تحقیق کے مسائل، تصحیح متن اور اس ضمن میں مختلف سوالوں پر اپنے تجربات کی روشنی میں لیکچرس دیئے، جو ہمارے لئے مشعل راہ بنے اور تحقیق و تدوین متن کی مشکل اور پر پیچ راہ آسان نظر آنے لگی۔

قبلہ نذیر صاحب اپنے اندر ایک انجمن تھے، بزرگی اور شفقت کی بے مثال تصویر۔ لہجہ انتہائی نرم، باتیں باوقار، طلب کچھ نہیں، عنایت بے حساب۔ آپ کی موجودگی گویا ایک نرم اور فرح بخش سایہ کا احساس۔ شخصیت ایسی جس سے وابستگی ہو اس کو اعتبار نصیب ہو جائے۔ جس ادارہ سے وابستہ ہوں اسی کا وقار بڑھ جائے۔ ان کی ذات انجمن ساز اور انجمنوں میں روح پھونکنے والی، آپ کو اگر کسی علمی و ادبی انجمن نے کسی انعام سے نوازا تو اس انعام کو اعتبار حاصل ہوا۔

استاد تو گویا ان سے بے نیاز، آخری دم تک علم و ادب کی خدمت پہ معمور، نئی ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اپنے شاگردوں اور فارسی زبان و ادب سے وابستہ لوگوں میں نیا شوق جگانے کا عمل مسلسل، یہ ہی آپ کی زندگی کا نصب العین۔

بستر علالت پر بھی علم و ادب کی گفتگو، نئی نسل کی تربیت کی فکر، فارسی زبان و ادب کی ترقی

اور حفاظت کا درد اور اپنی ذمہ داریوں کا پاس۔ استاد محترم فرماتے تھے کہ فارسی کے طالب علم کو ہر وقت اور ہر جگہ پر امتحان کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ ایسے بہت سے واقعات کا ذکر فرماتے تھے کہ کس طرح غیر متوقعہ طور پر لوگ سوال کر بیٹھتے ہیں اور ان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اُن کو جواب مل جائے گا۔

سرکاری اعزازات کی اکثر تقریبات راشٹر پتی بھون میں منعقد ہوتی تھیں۔ اس موقعہ پر کچھ فارسی کے دانشور بھی شریک ہوتے تھے جس میں نذیر صاحب بھی شامل ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر انعام یافتگان انعام پانے کی خوشی میں سرشار ہوتے تھے، اور فارسی کا کسی بھی وقت امتحان درپیش ہو جاتا تھا۔ کوئی بھی چھت کی طرف اشارہ کر کے سوال کر دیتا تھا، جناب یہ کیا لکھا ہے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ اور مطلب بھی بتا دیا تو یہ شعر کس کا ہے؟ شاعر کا نام بتائیں تو ان کے بارے میں اور بہت سے سوالات۔ گویا لوگ آج بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پڑھے لکھے کو فارسی کیا! یہ اعزاز صرف اور صرف فارسی جاننے والوں کو ہی حاصل ہے۔ ہمارے اکابرین نے صلہ اور شہرت کے خاطر علمی خدمات انجام نہیں دیں، بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا شکرانہ ادا کیا۔ ایرانی ناقد اور محقق عام طور پر ایک جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور آسانی سے غیر ایرانی ناقدین اور محققین کی بڑی بڑی کاوشوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہم نے ان اکابرین کو دیکھا ہے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔

جن کی علمی و ادبی کاوشوں کو ایرانیوں نے بھی خندہ پیشانی سے تسلیم کیا ہے اور مفاخر ادب کے طور پر ان کا اعتراف کیا ہے، اس قافلے کے سالاروں میں نذیر احمد صاحب اور سیّد امیر حسن عابدی شامل ہیں۔

■ ■ ■

غالب اور ایبک: پروفیسر نذیر احمد کے حوالے سے

ہندوستان کے مقتدر محققین میں چند ہی افراد ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے علم و ادب کے مختلف گوشوں میں تحقیقی کارنامے انجام دئے اور موضوعات کی گونا گونی کے باوجود اس کے ساتھ بھرپور انصاف کرنے میں کامیاب رہے۔ ایسے محققین میں پروفیسر نذیر احمد کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ اس موضوعاتی تنوع کے ساتھ جو بات حیرت زدہ کرنے والی اور ساتھ ہی آج کے محققین کے لیے مقام عبرت ہے، وہ ہے ان کی تحریر و ترتیب کردہ کتابوں، رسالوں، مقالوں اور مضامین کی تعداد۔ لگ بھگ ساٹھ سال کے اس علمی سفر میں، تین درجن سے زائد کتابیں، تقریباً اتنے ہی رسائل اور سیکڑوں کی تعداد میں اردو، فارسی اور انگریزی میں مقالے اور مضامین۔ بغور دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام انجام دینے میں نذیر صاحب نے جو وقت صرف کیا ہے، اس مدت میں کوئی اس کا مطالعہ بھی کرلے تو خود کو خوش نصیب تصور کرے۔ بلاشبہ، یہ ان کا جنون اور تحقیقی کاوشوں سے ان کا فطری لگاؤ ہی ہے، جس نے ان سے یہ کام انجام دلوالیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے اس Devotion اور اس استعداد کے لیے وہ ماحول اور اساتذہ بھی ذمہ دار ہیں، جو خوش نصیبی سے انھیں میسر آئے۔ ان میں پروفیسر مسعود حسین رضوی کا نام خاص طور

سے قابل ذکر ہے، جس نے ایک اچھے اور مشفق استاد کے ساتھ آدم شناس بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لائق اور باصلاحیت شاگردوں کا ایسا حلقہ تیار کیا، جو آیندہ بھی ان کی علمی وادبی روایات کو نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ اسے ترقی کے نئے منازل سے ہم آہنگ بھی کیا۔ پروفیسر نذیر احمد اسی سلسلۂ علمی کے ایک اہم ستون ہیں۔ آج جب کہ درسگاہوں اور علمی اداروں میں اس علمی شوق و سرگرمی کی جگہ بے کیفی اور بے مایگی بڑی سرعت سے سایہ فگن ہو رہی ہے، ایسے حالات میں ان بزرگوں کے کارناموں اور ان کی علمی وراثت کو سامنے لانے اور نسل نو کو اس سے آگاہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کی تنقیدی و تحقیقی تحریروں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان میں وہ جارحانہ انداز نہیں دکھائی دیتا، جو محمود شیرانی کے طرز نگارش کا خاصہ ہے۔ وہ عموماً اپنے متقدمین کی تحقیقات پر تنقید اور رائے زنی کیے بغیر اضافی اطلاعات کے ذریعہ اس کمی کو پورا کر دیتے ہیں۔

موصوف نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے اور ان کا تخصص کسی ایک موضوع تک محدود نہیں، بلکہ متعدد موضوعات پر محیط ہے، جن میں خاص طور سے فرہنگ ولغت شناسی اور زبان شناسی، تصحیح و تحقیق مخطوطات، نسخہ شناسی، اصول تحقیق، حافظ شناسی، غالب شناسی، سنائی شناسی، فنون لطیفہ، نقد ادب یا تنقید، تاریخ، تاریخ ادب وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ البتہ فرہنگ ولغت کی بحث و تحقیق ان کا سب سے مرغوب موضوع ہے اور اس حوالے سے ان کے کارنامے تمام علمی دنیا کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فارسی کی اہم ترین اور قدیم ترین لغات کی تصحیح و ترتیب کے حوالے سے جس تحقیقی کمال کا مظاہرہ کیا ہے، وہ انھیں کا خاصہ ہے مثلاً فرہنگ قواس، فخرالدین مبارک شاہ غزنوی، قبل از ۶۹۵ھ، دستورالافاضل، حاجب خیرات دہلوی، ۷۴۳ھ، زفان گویا، بدر ابراہیم، ۸۳۷ھ، لسان الشعراء، محمد عاشق، نقد قاطع برہان مع ضمایم، ۱۹۸۵ء، محمد حسین تبریزی ۱۰۶۲ھ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

فرہنگ اور لغت کے مباحث کے علاوہ موصوف کے یہاں جس موضوع سے گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے، وہ تاریخ ہے۔ چنانچہ انھوں نے بالخصوص ان دواوین و مخطوطات پر کام کیا ہے، جن کی تاریخی اہمیت ہے یا جن سے تاریخ کے کسی گوشے پر روشنی پڑتی ہے یا کسی نئی اطلاع کا انکشاف ہوتا ہے۔ دواوین کی تصحیح کے ذیل میں ان کی توجہ زیادہ تر تاریخی اطلاعات و

انکشافات کی طرف ہوتا ہے۔ شعریات کے تعلق سے وہ عروض وغیرہ سے بحث تو کرتے ہیں، لیکن شعری محاسن یا نقد کی طرف توجہ نہیں کرتے، یہ درحقیقت تاریخ یا تاریخی حقائق کی طرف ان کی توجہ، تمایل خاطر اور ان کی دلچسپی کی دلیل ہے۔ ان کے مضامین میں ایسے بے شمار عناوین مل جاتے ہیں، جو تاریخ سے متعلق ہیں مثلاً ہسٹری جرنل، ۱۹۵۹ء میں تاج محل کے معمار سے متعلق نئی اطلاعات کا انکشاف۔ مملوک اور مغل عہد کے امراء مثلاً نظام الملک جنیدی، عزالدین بختیار، غازان خان، خانوادۂ نور جہاں وغیرہ سے متعلق حقائق افزا مضامین، عہد اکبری میں فرقۂ نقطوی کا عروج، دکن کی تاریخ اور بہمنی، عادل شاہی حکمرانوں سے متعلق ان کے تحقیقی کارنامے وغیرہ۔ تاریخ ادب بھی تاریخ کا ہی ایک حصہ ہے، اور تاریخ سیاست و تمدن سے اس کا گہرا رشتہ ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تمدن کی روح کا جوہر ادبی شہ پاروں سے مترشح ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادبیات کی تاریخ نویسی زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ ادبی شہ پارے، تاریخی کرداروں کے بہ نسبت زندہ نمونے ہیں۔ چنانچہ ہیگل نے تاریخ نویسی کی تقسیم بندی میں تاریخ ادبیات کو 'خاص تاریخ' کے ضمرہ میں رکھا ہے، جو کسی قوم کے علمی، ادبی، فنی و ہنری فتوحات پر مشتمل ہوتا ہے۔

خود ''نقد قاطع برہان'' کی بحث میں جو فرہنگ سے متعلق ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ، اس حقیقت کی نقاب کشائی ہے کہ دساتیر (جو مبینہ طور پر ۱۶ کتابوں کا مجموعہ ہے اور پندرہ ایرانی پیمبروں اور ایک برگزیدہ شخصیات پر نازل ہوئی) ایک جعلی کتاب ہے، بلکہ اس میں شامل جعلی الفاظ کی بہتات ہے۔ لیکن بشمول غالب، دیگر فرہنگ نویس اور علماء اس کے استناد کے قائل تھے۔ غالب لکھتے ہیں:

> ''دساتیر صحیفۂ چند است کہ بر پیمبران پارس نازل شدہ است و آن زبان بہ ہیچ زبان مشابہ نیست، ساسان پنجم آنرا در زبان پارسی ناآمیختہ بہ عربی ترجمہ کردہ است۔''(۱)

چنانچہ شاعری میں بھی پروفیسر نذیر صاحب کو قصائد سے زیادہ رغبت ہے، کیوں کہ یہ تاریخی اطلاعات کا منبع ہیں۔ غالب نے ایک سوگندنامہ عرفی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اس اہم قصیدہ میں غالب نے کئی قدیم تاریخی اطلاعات سے استفادہ کیا ہے اور پروفیسر نذیر احمد نے اس کی توضیح کی ہے۔ اسی میں ایک شعر ہے کہ:

بدشتبانی ترکان ایبک وقپچاق　　　　به میرزائی خوبان خلخ ونوشاد

یہاں موصوف نے 'ایبک' کی توضیح میں لکھا ہے کہ:

"ایبک بمعنی بت مجازاً معشوق، بعض لوگوں نے بمعنی 'شل' لکھا ہے جو طبقات ناصری کی عبارت کے غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ غالب نے ایبک، ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام غلط لکھا ہے۔" (۲)

جب کہ 'قپچاق' کے متعلق پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ یہ:

"دشت و ناحیہ ای در شمال بحر خزر، ترکان قپچاقی یہیں ساکن تھے، اکثر گلہ بان تھے۔" (۳)

حالی نے "یادگار غالب" میں تحریر کیا ہے کہ "مرزا کے خاندان اور اصل وگوہر کا حال جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جابجا ظاہر کیا ہے، یہ ہے کہ ان کے آباواجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔" (۴) غالب کے لفظوں میں:

غالب از خاک پاک تورانیم	لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے	بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک	در تمامی زماہ دہ چندیم (۵)

البتہ حالی نے لفظ 'ایبک' کی توضیح کچھ یوں کی ہے کہ "ایبک ترکی لفظ ہے، مرکب آے اوز بیک ہے۔ آے چاند کو، اوز بیک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں۔ پس ایبک کے معنی ماہ تمام و بزرگ کے ہیں۔ اسی لیے مرزا نے کہا ہے 'در تمامی زماہ دہ چندیم'۔" (۶) البتہ "برہان قاطع" کے مطابق یہ لفظ ترکی کا ہے، جس کے معنی صنم اور بت ہیں۔ (۷) غالباً پروفیسر نذیر احمد نے "برہان قاطع" کے پیش نظر اپنا فیصلہ دیا ہے، جو قرین قیاس ہے۔ صاحب طبقات ناصری کے مطابق جب قطب الدین ایبک جوانی کو پہنچا تو تاجر اسے دربار غزنہ میں لے آئے اور سلطان غازی معز الدین سام نے اسے تاجروں سے خرید لیا۔ اگرچہ وہ قابل ستائش اوصاف اور برگزیدہ محاسن کا حامل تھا، مگر ظاہری حسن وخوبی سے خالی تھا۔ اس کی چھنگلی ٹوٹی ہوئی تھی، اس لیے اسے 'ایبک شل' کہتے تھے (یعنی وہ شخص جس کی ایک انگلی کمزور ہو)۔ البتہ معروف افغان مورخ استاد عبدالحی حبیبی قندھاری نے منہاج سراج کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ایبک کی اس توضیح کو بالکل

بے اصل کہا ہے اور اسے ایک ترک قبیلہ ہی بتایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ غالب کی رائے کو درست بتایا ہے۔(۸) معاصر افغان محقق پروفیسر محمد حسین یمین اس شہر (ایبک) کی وجہ تسمیہ کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ اس جگہ بدھ اور بودھ روایات سے متعلق بے شمار بت اور مجسمے تھے، اسی مناسبت سے اس کا نام ایبک رکھا گیا، جو صوبہ سمنگان میں مزار شریف اور کابل کے درمیان شاہراہ پر واقع ہے، البتہ عہد وسطیٰ میں صوبہ سمنگان کو ایبک بھی کہا جاتا رہا ہے اور دونوں مترادفات کے بطور استعمال میں رہے ہیں۔(۹)

یہاں یہ ذکر کرنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ راقم کے حالیہ سفر افغانستان کے دوران شمالی صوبہ سمنگان کے علاقے سے آئے کچھ افراد ملے، جن میں ایک وکیل یعنی ریاستی اسمبلی کے رکن عوض بیگ بیگوگلی نے بتایا کہ ان کا تعلق سمنگان صوبہ کے ضلع ایبک سے ہے۔ مزید یہ کہ یہ صوبہ کا مرکزی مقام بھی ہے اور ۸۰ گاؤوں پر مشتمل اس ضلع کی آبادی تقریباً ایک لاکھ کے قریب ہے، جن میں اوزبیک ۴۰ فی صد اور تاجیک ۴۵ فی صد ہیں۔(۱۰) ایک مورخ PaulClammer کے مطابق یہ خطہ کوشان سلطنت کے زمانے میں آباد ہوا اور بودھزم کا مرکز بنا۔ یہاں سے نزدیک ایک پہاڑی پر تاریخی کھنڈر کا نام تخت رستم ہے۔ اس مقام کا نام ایبک تب پڑا، جب عہد وسطیٰ میں باہر سے آئے کاروان یہاں ٹھہرنے لگے۔(۱۱)

البتہ یہاں یہ نکتہ توجہ طلب ہے اور وضاحت طلب بھی کہ کیا واقعی میرزا غالب نے 'ایبک' کسی قبیلہ کا نام لکھا ہے یا ان کی مراد یہ ہے کہ جس قبیلہ سے ان کا تعلق تھا، اس کا نام 'ایبک' تھا؟ ان کے مذکورہ شعر سے اس کی کوئی حتمی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ: ''ایبکیم از جماعۂ اتراک''، جس کا درست ترجمہ یوں ہوگا کہ ترکوں کی ایک جماعت جو اہل ایبک ہے، اس سے ان کا تعلق ہے۔ بقول خود ''میں قوم کا سلجوق ترک ہوں۔ میرا دادا (میرزا قوقان بیگ) ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت ہندوستان آیا۔''(۱۲) غالباً یہ غلط فہمی مولانا حالی کے مذکورہ شعر کے ترجمہ سے ہوئی ہے کہ ''ان کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔'' اور بظاہر پروفیسر نذیر احمد اور استاد حبیبی کی مذکورہ رائے بھی یہیں سے مستنبط ہے۔ جب کہ استاد حبیبی وہ خود دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

بلخ اور بامیان کے درمیان یہ مقامات ہیں: بامیان، سیغان، کھمرد، مدر،

روئی، خرم وسار بند اور ایبک۔ (۱۳)

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل 'ایبک' سے غالب کی مراد وہ مقام ہے، جہاں ان کے آبا و اجداد آ بسے تھے اور وہ ترک نژاد تھے۔ بعد ازاں انھوں نے ہندوستان کوچ کیا۔ مزید یہ ترکوں کی اس شہر میں آمد کے بعد اس کا نام ایبک پڑا کیوں کہ وہاں مہاتما بدھ اور بودھ مذہب سے متعلق بتوں اور مجسموں کی بہتات تھی اور ترکی میں بت کو ایبک بھی کہتے ہیں۔

منابع و مآخذ:

۱۔ نقد قاطع برہان، ص۔۲۸۴)

۲۔ پروفیسر نذیر احمد، غالب پر چند مقالے، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص۔۶۱

۳۔ ایضا

۴۔ حالی، خواجہ الطاف حسین، یادگار غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص۔۹

۵۔ ایضا، ص۔۱۲

۶۔ ایضا

۷۔ تبریزی، ابن خلف، برہان قاطع (تصحیح۔ محمد عباسی)، ص۔۱۳۴

۸۔ منہاج سراج، طبقات ناصری، جلد اول (ترتیب و تحشیہ۔ عبدالحیٔ حبیبی قندھاری)، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۔۴۰۷۔۴۰۶

۹۔ یمین، دکتر محمد حسین، شناسنامہ افغانستان تاریخی، انتشارات سعید، کابل، ص۔۱۶۷

۱۰۔ (https://en.wikipedia.org/wiki/Samangan_Province)

۱۱۔ (Clammer, Paul (2007). Afghanistan. Lonely Planet. p. 158.)۔

۱۲۔ شریف الحسن، غالب کون ہے؟، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۔۹

۱۳۔ منہاج سراج، طبقات ناصری، جلد اول (ترتیب و تحشیہ۔ عبدالحیٔ حبیبی قندھاری)، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۔۴۱۰؛ جلد دوم۔ ص۔۳۷۳

سید کلیم اصغر

پروفیسر نذیر احمد کے ہم عصر پروفیسر ولی الحق انصاری کی شاعری

پروفیسر ولی الحق انصاری کا شمار ہندوستانی معاصر فارسی شعراء کی فہرست میں صف اول میں ہوتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۴؍ مئی ۱۹۲۷ء کو لکھنو کے مشہور علمی خانوادہ فرنگی محل میں ہوئی اور تعلیمی سلسلہ بھی لکھنو ہی میں رہا یعنی ابتدا سے ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم لکھنو ہی میں حاصل کی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شیعہ کالج لکھنو میں ایک سال تک درس وتدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے صدر پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی دعوت پر لکھنو یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے فارسی زبان وادب کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ انصاری صاحب کا اصل میدان فارسی نہیں تھا۔ آپ کو اقتصادیات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی لئے اکنامکس میں ایم۔ اے کیا۔ قانون سے بھی لگاؤ رہا اسی لئے LLB کی بھی ڈگری حاصل کی۔ اکنامکس میں ایم۔ اے اور LLB کے بعد ۱۹۴۹ میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ فارسی کی شیرینی نے انصاری صاحب کے دل کو اس طرح موہ لیا کہ فارسی کے بن کے رہ گئے اور جلد ہی صدر شعبہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں، نہایت ہی حسن وخوبی کے ساتھ شعبہ فارسی لکھنو یونیورسٹی کو آگے بڑھایا۔ انصاری صاحب کے شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۷ء تک درس وتدریس کے ساتھ ساتھ صدر شعبہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے (۸) آٹھ سال کی عمر میں یونیورسٹی کے

فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔

پروفیسر انصاری بچپن ہی سے نہایت ذہین اور محنتی تھے۔ درس و تدریس میں ہمہ تن مشغول رہا کرتے تھے۔ شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانے سے ہی رہا۔ یہاں تک کہ زمانہ طالب علمی سے لکھنؤ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے شرکت کیا کرتے تھے۔

انصاری صاحب نہ صرف فارسی میں شعر کہتے بلکہ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ اس طرح ہندوستان کے ذوالسانین شعراء جیسے میر، غالب اور اقبال کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور دونوں زبانوں میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب رہے۔ انصاری صاحب ذوالسان شاعر ہونے پر فخر بھی کرتے تھے۔ اور کہتے تھے میر مظہر، سودا، اقبال و غالب کی طرح میں بھی دو زبانوں یعنی فارسی اور اردو میں شاعری کرتا ہوں۔ انصاری صاحب لکھتے ہیں کہ یہ لوگ تو چلے گئے لیکن اس دور میں شاعر ذوالسان میں ہوں۔ ولی صاحب نے "ای بلبلان گلشن شیراز و اصفهان" کے عنوان سے کہی گئی نظم میں اپنے اس دعوے کو اس طرح سے ثابت کیا ہے۔

رفتند میر و مظهر و سودا و میر درد
در بارگاه شعر کنون ذو السان منم
غالب که بود فخر سخن گستران دهر
هم رفت و بعد او سر گویندگان منم
اقبال هم ز انجمن شعر در گذشت
چون او، کنون سخنور جادو بیان منم
نی حسرتی، نه بیخود و یاس اند در جهان
در سرزمین هند کنون بعد شان منم
اردو و فارسی ست مرا مثل شان عزیز
چون شان به هند شاعر هر دو زبان منم
در شبه قاره نیز نه جوش است نی فراق

در بزم ریختہ کنون گوہر فشان منم
بعد از رہی ز بزم سخن شہریار رفت
اکنون دیار شعر ترا پاسبان منم
ای سرزمین حافظ و سعدی برای تو
از طوطیان ہند یکی ارمغان منم
(گل افشانی خیال، ص ۱۳۲)

بہر حال پروفیسر ولی الحق انصاری کا شمار ان بزرگ شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے اور تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ انصاری صاحب نے علمی و ادبی کارناموں کے طور پر چند مجموعہ ہای کلام اردو و فارسی بہ عنوان یادگار چھوڑے ہیں۔ آپ کے اردو اشعار کے مجموعے اس طرح ہیں:

۱۔ غزالان خیال: غزلیات کا پہلا مجموعہ کہ جو ۱۹۸۰ میں شائع ہوا۔
۲۔ فروغ شعلہ دل ۳۔ شاہدان معانی ۴۔ گلزار ۵۔ نقوش زیبا ۶۔ انفاس گرم ۷۔ زاد آخرت ۸۔ کہکشاں

فارسی میں آپ نے کافی سرمایہ اہل ادب کے حوالے کیا۔ بالخصوص نظم کے میدان میں آپ کافی آگے نظر آتے ہیں۔

انصاری صاحب کے فارسی کلام کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ شعلہ ادراک: یہ پہلا مجموعہ قصائد، منظومات، غزلیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔
۲۔ خرمن گل: یہ دوسرا مجموعہ ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔
۳۔ شب چراغ: یہ تیسرا فارسی مجموعہ ہے جس میں غزلیات، منظومات، قطعات اور بالخصوص قطعات تاریخی موجود ہیں۔
۴۔ ان کے علاوہ رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران دہلی کی جانب سے "منتخبی از اشعار ولی الحق انصاری" کے نام سے "شعلہ ادراک" سے آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے۔
۵۔ اسی طرح کا دوسرا انتخاب "چلچراغ عشق" کے نام سے "شب چراغ" سے انتخاب کردہ اشعار بھی رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران دہلی نے شائع کیا ہے۔

۶۔ گل افشانی خیال: بیاض اشعار پروفیسر ولی الحق انصاری کے نام سے ۲۰۱۰ء میں کتابخانہ رضا رامپور سے شائع ہوئی۔ یہ بیاض دراصل کلیات ولی الحق انصاری ہے۔ بیاض ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شعلہ ادراک، خرمن گل اور شب چراغ میں موجود کلام کے علاوہ آپ کا باقی غیر مطبوعہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ آزادی ہندوستان ۱۹۴۷ کے بعد اور شاعر مشرق علامہ اقبال کی کلیات کے بعد یہ پہلی کلیات فارسی ہے جو پروفیسر انصاری کے کلام پر مشتمل سرزمین ہند پر شائع ہوئی۔ ان تمام کارناموں کے علاوہ آپ کا ایک عظیم کارنامہ کلیات عرفی شیرازی کی تصحیح و تدوین کی ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں آپ نے کلیات عرفی کے معتدد نسخوں سے مقایسہ و مقابلہ کیا اور یہ ۱۳۷۸ھ ش کو تہران یونیورسٹی تہران سے شائع ہوئی۔ ایران میں اس کارنامہ کی کافی ستائش ہوئی۔

آپ کے ادبی کارناموں بالخصوص آپ کے کلام کی ستائش ایران اور ہندوستان کے ادیبوں، دانشوروں، اساتذہ اور محققین نے بھی کی ہے۔

ہندوستان کے ممتاز استاد پروفیسر نذیر احمد، ولی الحق انصاری کے دیوان کے سلسلے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"استاد انصاری ذهن رسا و فکر عالی دارند و اشعار ایشان دارای افکار و احساسات بلند و لطیف است. این امر بسیار جالب توجه است که پروفسور ولی الحق انصاری موفق شده که افکار خودرا در طرز ساده و دلنشین بروز دهند. پروفسور انصاری با سخنواران سبک هندی علاقه دارد و مخصوصاً سبک عرفی شیرازی را که قافله سالار این گروه هست. پیروی می نمایند". (ہندوستان میں فارسی شاعری، ص ۲، ۷)

ایران کے دانشور، فہرست نگار محقق احمد منزوی، انصاری صاحب کے دیوان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"دیوان آقای دکتر ولی الحق انصاری را مرا تا آنجاکه وقت بود خواندم بسیار خوشنود شدم که هنوز زبان

فارسی در هند تا این اندازه زنده است و از افکار
باریک استاد بزرگوار لذت بردم. امید که این افکار
چاپ شود و دیگران نیز از خواندنش لذت
برند". (شب چراغ، ص ١٦)

بابای فارسی ہند پروفیسر امیر حسن عابدی، ولی الحق انصاری کے دیوان کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"پروفسور ولی الحق انصاری شاعر چیره دست هر دو زبان
اردو و فارسی هستند و چند تا مجموعه کلام اردو ایشان تا
حال چاپ شده است. حالا ایشان کلام فارسی خودش را
بشکل مجموعه بنام "شعله ادراک" ترتیب داده اند. اینجانب
نسخهٔ خطی این مجموعه را خواندم و لذت بردم. امید که بعد
از انتشار این دیوان پروفسور ولی الحق انصاری مورد مطالعه
دانشمندان و خوانندگان گرامی خواهد شد. بعد از استقلال
هند این اولین دیوان چاپی فارسی است. که در نتیجه زحمت
یک شاعر هندی بوجود آمده است". (گل افشانی
خیال، ص ٣٦)

فارسی کے موجودہ دانشور، محقق پروفیسر شریف حسین قاسمی، انصاری صاحب کے کلام اور سبک کے بارے میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

"استاد انصاری حتماً تنها فارسی گوی معاصر هند بچشم می
رسد. ایشان دو دیوان فارسی را بچاپ رسانده اند. حالانکه ایشان
از بینایی تقریباً محروم گشته و عمر ایشان از هشتاد سال تجاوز
کرده است. آثار کهولت و پیری از فکر ایشان پیدا نیست و هنوز
سرودن اشعار در هر دو زبان اردو و فارسی اشتغال دارند. اما
چنانکه گفتم سبک ایشان مخصوص بخود ایشان است. خلاصه
این که توان گفت که غزلیات استاد چه طبع زاد و چه آنکه در

زمین های دیگران گفته شده. عاری از رکاکت و ابتذال و دارای افکار و اندیشه های بلند است و شیوه لطیف و پیرایه دلکش دارندو در زمین های غزلهای شعرای استاد، غزل گفتن کار سهل نیست ولی استاد اینجا هم از عهده خود بخوبی بیرون آمده اند".
(گل افشانی خیال، ص ۲۷)

شاعری: پروفیسر انصاری کو شاعری پر مکمل عبور حاصل تھا۔ بچپن ہی سے آپ کو شعر و شاعری سے بیحد لگاؤ رہا۔ آپ نے اسکول میں رہتے ہوئے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اشعار کہا کرتے تھے، لیکن فارسی میں شعر کہنا آپ کو اپنے مزاج سے زیادہ نزدیک معلوم ہوتا تھا۔ اسی لئے آپ نے اپنی زیادہ توجہ فارسی شاعری پر صرف کی۔ ولی الحق انصاری نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک فارسی میں شاعری کی اور شاعری ہی کو اپنی طولانی حیات کا وسیلہ جانا۔ انصاری صاحب کو شعر گوئی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ آپ شعر گوئی کو کتنا عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

درین عالم که پایم سست و چشمم بی بصارت شد
نه شد گر شعر یارم تا کنون من مرده می گشتم
به فیض شعر اشعارم حیات تازه می یابم
بدون لمس این شبنم چو گل افسرده می گشتم

(گل افشانی خیال. ص ۳۲)

انصاری صاحب شعر کو اپنی زندگی جانتے تھے۔ مندرجہ بالا اشعار میں آپ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ شعر ہی کا کمال ہے جو دست و پا کام نہ کرنے کے باوجود آنکھوں سے بینائی ختم ہونے کے بعد بھی مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگر مجھ میں شعر گوئی کا ملکہ نہیں ہوتا تو میں کن کا مر گیا ہوتا۔ اشعار میں ایسا جادو ہے کہ جس کے توسط سے میں زندہ ہوں اشعار کے جادو ہی بنا پر مجھے حیات تازہ ملی ہے۔ جس طرح شبنم کے بنا پھول افسردہ ہو جاتا ہے اسی طرح بنا شعر کہے میں بھی مردہ کے مانند ہوں۔

انصاری صاحب کی غزلیات میں نہایت ہی سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ جو قاری کو ایک

طرح کے غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔آپ کی بہت سی غزلیں عارفانہ رنگ میں ملتی ہیں اور اشعار حقیقت سے بہت نزدیک ہیں۔آپ نے شعر گوئی میں خاص طور سے لسان الغیب حافظ شیرازی، مولانا جلال الدین رومی، عرفی شیرازی اور نظیری نیشاپوری کی تقلید کی۔انصاری صاحب نے فارسی کے کلاسیک اور معاصر شعرا کی غزلوں کی زمین میں بھی غزلیں کہی ہیں۔حافظ کی مشہور غزل کی زمین میں:

حافظ کہتے ہیں
بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است

انصاری کہتے ہیں
ہر آنچہ شکل پذیر است، نقش برباد است
مجو ثبات ز عالم کہ خود عدم زاد است
(بیاض ص ۱۵۹)

مولانا رومی کہتے ہیں
بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
بکشان لب کہ قند فراوانم آرزوست

انصاری کہتے ہیں
عمر ابد نہ چشمہ حیوانم آرزوست
در راہ تو نثار کنم جانم آرزوست
یک کاسہ گلی و حصیری مرا بس است
نی جام جم نہ تخت سلیمانم آرزوست
(بیاض ص ۱۵۱)

عرفی کہتے ہیں
تنہا نشین گوشہ غم خانہ خودیم
گنج غمیم و در دل ویرانہ خودیم

انصاری کہتے ہیں
مست شراب ہمت مردانہ خودیم
ما عالم آشنا ولی بیگانہ خودیم
(بیاض ص ۱۶۵)

نظیری کہتے ہیں
داغ دل در عشق افسردن نمی داند کہ چیست
لالہ این باغ پژمردن نمی داند کہ چیست

انصاری کہتے ہیں
کشتہ راہ وفا مردن نمی داند کہ چیست
این گل خوش رنگ افسردن نمی داند کہ چیست
(بیاض ص ۲۳۳)

اپنے ہم عصر شعراء جیسے محمد رضا شفیعی کدکنی اور ڈاکٹر مظاہر مصفا کی زمین میں بھی شعر کہے۔

شفیعی کہتے ہیں
دارم سخنی با تو که گفتن نتوانم
وین درد نهان سوز نهفتن نتوانم

انصاری کہتے ہیں
بسیار سخن در دل گفتن نتوانم
انبار گهر دارم و سفتن نتوانم
(شعلہ ادراک، ص ۱۷۷)

مظاہر مصفا کہتے ہیں
خونین دلیم و از دل خونین گسسته ایم؟
اشکیم و دل به نیشتر مژه خسته ییم؟

انصاری کہتے ہیں
از سنگ حادثات جهان پا شکسته ییم؟
ای خضر! نگه بسوی ما، که خسته ییم؟
(شعلہ ادراک، ص ۲۸۳)

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ولی الحق انصاری ہندوستان میں آزادی کے بعد فارسی کے تنہا ایسے شاعر ہیں جن کا کلام اس دور کے ایرانی شعراء کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ عظیم ہندوستان کا یہ عظیم شاعر ۲۸ رفروری ۲۰۱۳ء کو جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ لکھنو کے قبرستان ''باغ انور'' میں ابدی نیند سو گیا ہے مگر اس کا کلام لوگوں کے ذہنوں کو ہمیشہ جگاتا رہے گا۔

مآخذ:

۱۔ شعلہ ادراک، محمد ولی الحق انصاری، نظامی پریس، ۱۹۸۷ء لکھنو

۲۔ شب چراغ، محمد ولی الحق انصاری، انتشار دارالامان، فرہنگی محل، لکھنو، ۲۰۰۷_۲۰۰۶ء

۳۔ گزیدہ اشعار، محمد ولی الحق انصاری، رایزن فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو

۴۔ گل افشانی خیال، بیاض اشعار، پروفیسر محمد ولی الحق انصاری، کتابخانہ رضا رامپور

۵۔ ہندوستان میں فارسی شاعری، خصوصاً ۱۹۴۷ء کے بعد، ڈاکٹر علی سلمان رضوی، مطبع: ٹی۔ آر۔ پرنٹرس، خوریجی دہلی۔ ۲۰۰۶

محمد احتشام الدین

پروفیسر نذیر احمد - ایک عظیم محقق و ممتاز غالب شناس

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں فارسی ادب کے محققین اور دانشمندوں میں پروفیسر نذیر احمد کا نام سرفہرست ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نہ صرف فارسی ادب بلکہ اردو ادب کے بھی ممتاز محقق ہیں۔ آپ کی تحقیق سے نہ صرف یہ کہ فارسی زبان و ادب کا دامن وسیع ہوا بلکہ متنی تحقیق کے، جو آپ کا طرۂ امتیاز ہے، اصول وضوابط بھی مقرر ہوئے۔ مخطوطہ شناسی کے میدان میں آپ نے نادر مخطوطات کی بازیافت، اس کے مصنف، مرتب اور کاتب کے سلسلہ میں بے شمار اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے پانچ سو سے زائد شخصیات اور متعدد کتابوں کی بازیافت کی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ بالکل منفرد ہے۔ آج نہ صرف ایران بلکہ تمام فارسی دنیا میں پروفیسر نذیر احمد کا نام اس لئے احترام سے لیا جاتا ہے کہ آپ کی روش تحقیق اور اس کے لئے مقرر کردہ اصول وضوابط کو بڑی حد تک مکمل اور مناسب سمجھا گیا اور اس کی پیروی کو ترجیح دی گئی۔

فارسی ادب میں تحقیق کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ ایران میں علامہ قزوینی پہلے شخص تھے جنھوں نے تحقیق کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر محمد معین، دہخدا وغیرہ جیسے صاحبان علم نے دقت نظر اور جزئیات کی چھان بین پر زور دیا۔

ہندوستان میں حافظ محمود شیرانی، ایسے پہلے شخص ہیں جنہوں نے تحقیق کے روایتی انداز کو بدلا اور تحقیق و تدوین کا راستہ دکھلایا۔ حافظ محمود شیرانی کے بعد پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح علامہ قزوینی، محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود نے اپنی سعی و کوشش اور تلاش و جستجو سے فارسی زبان و ادب کے تحقیقی معیار کو بلند کیا اسے پروفیسر نذیر احمد نے اپنی کوششوں سے اور بھی بلند تر کیا ہے۔

نذیر صاحب کی تحقیق و تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ادب، زبان، قواعد زبان، مخطوطہ شناسی، تاریخ، فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری، خطاطی وغیرہ پر ان کی تحریریں مستند اور معیاری سمجھی جاتی ہیں۔ فارسی زبان و ادب کے تعلق سے پروفیسر نذیر احمد صاحب کی کثیر الجہات اور گراں قدر خدمات کا احاطہ کرنا مجھ جیسے فارسی کے ادنی طالب علم کی قدرت اظہار سے بالاتر ہے۔ لہذا اس مختصر مقالہ میں نذیر صاحب کی غالب سے متعلق تحقیقات کے چند گوشوں پر روشنی ڈالنے کی ایک حقیر کوشش کی گئی ہے۔

غالب پروفیسر نذیر احمد صاحب کے مطالعے کا خاص موضوع رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ غالب پر ان کی تحریریں کسی طرح دوسرے ماہر غالبیات سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیق کے ذریعہ بڑے بڑے عقدوں کو حل کیا اور گرانقدر معلومات بہم پہونچائیں۔ نذیر صاحب نے نہ صرف خود غالب شناسی کے بیشتر پہلوؤں پر غور و فکر کیا ہے بلکہ اپنی غالب شناسی کے ذریعہ اہل نظر اور دیگر محققین کے لئے نئی راہیں بھی کھولی ہیں۔ غالب پر ان کی تصنیف کردہ پانچ کتابیں ہیں:

۱- نقد قاطع برہان، ۲- تحقیقات (مجموعہ مضامین)، ۳- تنقیدات (مجموعہ مضامین، ۴- غالب پر چند تحقیقی مقالے، اور ۵- غالب پر چند مقالے۔

ان کتابوں کے علاوہ غالب کے تعلق سے ان کے کچھ اور مضامین بھی ہیں جو رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ نذیر صاحب نے غالب پر جو مضامین تحریر کئے ہیں ان کی تعداد بیس سے زائد ہے۔ لیکن پروفیسر نذیر احمد دوسرے غالب شناسوں سے اس اعتبار سے منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں کہ انہوں نے رسمی موضوعات کے بجائے علمی، لغوی اور شعری صنعتوں سے متعلق مسائل کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ اس کا اندازہ غالب پر ان کے مقالات کے

عنوان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً غالب کے اردو اور فارسی مکتوبات کے لغوی مسائل، غالب کی تلمیحات، غالب فرہنگ نگار کی حیثیت سے، دستنبو اور دساتیر، لفظ بیرنگ غالب کے ایک شعر میں، پنج آہنگ میں غالب کے منتخب الفاظ، غالب کے ایک نایاب خط کے بارے میں چند توضیحات، نقد فرہنگ غالب، غالب کی ایک دل پسند فارسی فرہنگ: سرمہ سلیمانی، غالب کے ایک خط کے چند علمی مسائل، غالب کے ایک خط کے بعض امور کی توضیح، غالب کے ایک شعر کی چار تلمیحات، غالب کے شعر میں ایک دلچسپ تلمیح، وغیرہ۔

نذیر صاحب نے غالب کے مکاتیب اور نثر و نظم سے تعلق رکھنے والے متعدد مسائل پر نہایت معنی خیز انداز میں لکھا ہے اور اپنے ہر مضمون میں کسی نہ کسی ایسے گوشہ کی نقاب کشائی کی ہے جس کی طرف بہت کم محقق یا غالب شناس نے توجہ کی ہے۔ نذیر صاحب کی یہی خصوصیت انہیں دیگر ماہر غالبیات سے ممتاز کرتی ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں بہت سے علمی، ادبی، تاریخی و لسانی مسائل سے بحث کی ہے۔ نذیر صاحب نے ان کی اہمیت کے پیش نظر اس طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی اور اسے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''...انہوں نے (غالب) اپنے مکاتیب میں سیکڑوں علمی، ادبی، شعری، فنی، تاریخی سیاسی امور پر بحث کی ہے اور میرے خیال میں ان کے کلام کا یہ رخ جو در حقیقت ایک دائرۃ المعارف کی وسعت اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے بالکل اچھوتا ہے''۔ (غالب نامہ، جلد ۱۴، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۳، ص ۱۲)

نذیر صاحب نے اپنے مقالہ بعنوان 'غالب کے ایک شعر کی چار تلمیحات' میں غالب کے درج ذیل شعر

به دشتبانی ترکان ایبک و قبچاق
به میرزائی خوبان خلّخ و نوشاد

میں ایبک، قبچاق خلّخ اور نوشاد چاروں الفاظ سے جسے غالب نے بطور تلمیح استعمال کئے ہیں، سیر حاصل بحث کی ہے۔ غالب نے درج بالا شعر میں ایبک سے ترکوں کا ایک قبیلہ مراد لیا ہے جو

گلہ بانی کیا کرتا تھا۔ نذیر صاحب کے نزدیک یہ درست نہیں۔ نذیر صاحب نے بڑی باریک بینی اور دقت نظری کے ساتھ مختلف فرہنگوں کے حوالے سے اس لفظ کی تشریح و توضیح کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لغوی معنی، اختلاف املا، وغیرہ کی بھی وضاحت کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایبک ایک شخص کا نام یا نام کا جز ہے۔ ان کے مطابق ترکوں کے متعدد قبیلے گلہ بان تھے جن میں سلجوق اور غز خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'غالب ترکوں اور ترکمانوں کی گلہ بانی تو جانتے تھے لیکن ان کے قبیلوں سے واقف نہ تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے ایبک کو ایک ترک قبیلہ بتادیا'۔

(غالب نامہ، جلد، ۱۵، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۴، ص ۱۳۰-۱۳۱)

اسی طرح ایک دوسرے مقالہ میں غالب کے ذریعہ استعمال کی گئی 'ترنج زر' اور 'طلاے دست افشار' کی تلمیح پر مدلل گفتگو کی ہے اور مختلف فرہنگوں، تاریخوں اور شعرا کے کلام سے اس کے شواہد پیش کئے ہیں۔ غالب نے اپنی ایک مثنوی میں جو آم کی توصیف میں ہے، ترنج زر اور طلاے دست افشار کو الگ الگ تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس مقالہ میں پروفیسر موصوف کا سارا ارتکاز اس امر پر ہے کہ یہ دونوں الگ الگ تلمیح نہیں بلکہ ایک ہے۔ اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''طلای دست افشار یا مشت کی جو تفصیلات فرہنگوں، تاریخوں اور شعرا کے کلام سے پیش کی گئی ہے اس سے واضح ہے کہ یہ تلمیح کافی دلچسپ ہے اور اسی بنا پر غالب نے بھی استعمال کیا لیکن نہ بھولنا چاہیے کہ ترنج زر اور طلای دست افشار الگ الگ تلمیح نہیں، یہ دونوں ایک ہی تلمیح ہے یعنی ترنج زرّ دست افشار پرویز' (غالب نامہ، جلد، ۱۶، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۹۵، ص ۱۱۰)

بلا تردید اس تلمیح کی اصل اور اس کی اہمیت جاننے کے بعد قارئین کو غالب کے اشعار کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

نذیر صاحب کو الفاظ، تراکیب اور لغوی بنیادوں سے گہری دلچسپی تھی اس وجہ سے نظم ونثر دونوں میں لسانی شناختوں کا مسئلہ ان کی نکتہ آفرینی کا مخصوص دائرہ کار بن گیا ہے۔ نذیر

صاحب کا ایک مقالہ ’غالب اور ذال فارسی‘ کے عنوان سے ہے۔ جس میں انہوں نے غالب کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ فارسی میں ذال معجمہ کا وجود نہیں ہے اور یہ عربی حرف ہے۔ غالب کے مطابق فارسی میں دو متحد المخرج یا قریب المخرج حرف نہیں آتے۔ اس طرح انہوں نے بطور کلی ذال فارسی کے وجود سے انکار کیا ہے اور گذاشتن، گذشتن، پذیرفتن وغیرہ کا املا ذال کے بجائے زے سے بتایا ہے۔ سب سے پہلے قاضی عبدالودود نے اس موضوع پر لکھا اور پانچویں صدی ہجری سے لے کر اپنے عہد تک ایرانی علما، فضلا و شعرا کے اقوال و اشعار کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ یہ بھی ذال کو فارسی حرف تسلیم کرتے ہیں۔ نذیر صاحب نے بھی بڑے مدلل طریقے سے اس پر بحث کی ہے اور مختلف فرہنگوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب نے اس سلسلہ میں جو بھی ثبوت پیش کئے ہیں وہ درست نہیں۔

نذیر صاحب کے تحقیقی کارناموں کے مطالعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ تحقیق کے لئے ایسے موضوع کا انتخاب کیا جو واقعاً دقیق تحقیق کا متقاضی تھا۔ آپ کے تحقیقی مقاصد میں نئے مآخذ کو روشناس کرانا، تاریک گوشوں کو روشن کرنا اور کسی خلا کو نئی معلومات سے پر کرنا اہم تھا۔ نقد قاطع برہان، غالب اور ذال فارسی، فرہنگ غالب وغیرہ اسی قبیل کے مضامین ہیں۔

’نقد قاطع برہان‘ میں نذیر صاحب نے غالب کی تالیف ’قاطع برہان‘ پر نہایت محققانہ اور عالمانہ گفتگو کی ہے۔ غالب نے ’قاطع برہان‘ میں محمد حسین تبریزی کی مرتب کردہ فرہنگ ’برہان قاطع‘ پر اعتراضات کی جھڑیاں لگا دی تھیں۔ غالب کی اس تالیف کے منظر عام پر آنے کے بعد ایک ادبی معرکہ چھڑ گیا۔ چاروں طرف سے اس کے رد میں مضامین رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ قاضی عبدالودود، پروفیسر عبدالستار صدیقی، قدرت نقوی وغیرہ نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا لیکن نذیر صاحب کی تحریر کے بعد اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ نذیر صاحب فرہنگ نگاری کے میدان میں غالب کا مقام متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب فرہنگ نویسی کے مرد میدان نہیں تھے کیوں کہ فارسی لغت نگاری علوم و فنون اور علم زبان میں جس دستگاہ کی متقاضی ہے وہ غالب میں بخوبی موجود نہ تھی۔ اس بنا پر انہوں نے لغوی و دستوری مسائل پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے وہ بڑی حد تک غیر قابل توجہ ہیں۔ اس سلسلہ میں نذیر صاحب نے مختلف فرہنگوں سے مثالیں پیش کی ہیں اور یہ ثابت کیا

ہے کہ غالب کے بیشتر اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

برہان میں دانم بمعنی توانم ہے، غالب اس سے ناواقف ہیں۔ فرہنگ جہانگیری میں داند بمعنی تواند و دانم بمعنی توانم آیا ہے اور ثبوت کے طور پر حکیم نزاری قہستانی کا یہ شعر درج ہے:

مگر خود این شب یلدا بروز دانم برد
کدام یلدا که این شب هزار چندانست

ہر سخن فہم پر یہ واضح ہے کہ درج بالا بیت میں دانم برد بمعنی توانم برد استعمال ہوا ہے۔

نذیر صاحب غالب کی 'قاطع برہان' کو فرہنگ کے زمرہ میں بھی نہیں گردانتے کیوں کہ یہ فرہنگ نویسی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ بہ الفاظ دیگر قاطع برہان الفاظ کے املا، تلفظ، معنی، طریق استعمال وغیرہ سے عاری ہے۔

غالب نہ صرف اپنے دور کے سب سے ممتاز فارسی شاعر تھے بلکہ فارسی نثر نگاری میں بھی انہوں نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا تھا۔ غالب کی ذہانت اور طباعی کا ہر کوئی قائل ہے اور غالب کی یہی طباعی ان کی تمام تحریروں میں دلکشی پیدا کرتی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کے مطابق ایسی طبیعت والا انسان بھلا قدما کی روش کیوں کر پسند کرتا اور اسی وجہ سے انہوں نے نثر میں اپنی الگ راہ نکالی۔ غالب نے فارسی سرہ یعنی خالص فارسی لکھنے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں وہ بھٹک کر دساتیر کے جال میں بھی پھنسے اور جس کے نتیجے میں ان کی نثری تخلیقات میں دساتیر جیسی جعلی کتاب کے بے شمار الفاظ داخل ہو گئے۔

غالب کی تحریروں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں دساتیر سے خاص رغبت تھی۔ غالب نے اپنی نثر و نظم دونوں میں دساتیری الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے نذیر صاحب لکھتے ہیں:

"دساتیر کی زبان عربی اثرات سے یکسر پاک تھی، اس کے اکثر و بیشتر الفاظ فارسی سرہ کے چربے ہیں اس وجہ سے فارسی خالص کے شیدائیوں کے لئے اس کتاب میں بڑی کشش تھی، غالب فارسی سرہ کے پرستار تھے، اس بنا پر ان کا دساتیر سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا"۔

(غالب نامہ، جلد ۱۴، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۳، ص ۱۲)

پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ غالب نے قصائد میں بھی دساتیری الفاظ استعمال کیے ہیں جیسے فرتاب اور سمراد۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں انہوں نے غالب کے قصیدے سے متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً:

شاهی که بفرتاب نظر مهر فر آمد

اور

چه فرّخست ظفر چون بود بدین فرتاب

یا

ستاره رفت به چشمك زنی گه سمراد

ان ابیات میں فرتاب اور سمراد دساتیری الفاظ ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سمراد بروزن فرہاد بمعنی وہم وفکر وخیال کے ہے، یہ لفظ فارسی میں نہیں آتا۔ اسی طرح فرتاب بمعنی کرامت، فرتاب لفظ برہان میں شامل نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد دساتیری الفاظ کی وضاحت کی ہے جنہیں غالب نے دستنبو میں استعمال کیے ہیں، مثلاً درنگ و نیرنگ نمایۂ آنست: نمایہ فارسی میں نہیں آتا اور برہان قاطع میں بھی یہ لفظ موجود نہیں ہے۔

سرمایۂ نمانمای خویش: یعنی سرمایہ خودنمائی: وہ لکھتے ہیں کہ 'نمانما' فارسی میں بے سابقہ ہے اور برہان میں بھی یہ لفظ مندرج نہیں ہے۔ اس طرح بے شمار الفاظ ہیں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

غالب نے فارسی سرہ لکھنے کی غرض سے متعدد ایسے الفاظ اور تراکیب وضع کی ہیں جو اس سے قبل نثر نگاروں کے یہاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں اور کچھ ایسے الفاظ وتراکیب بھی ہیں جو خود غالب کے وضع کردہ ہیں، مثلاً سخن پیوند، صفحۂ اندیشۂ بیرنگ، اندلیش آسمان پیوند، داغ منت خس، دردمنت کش، گام سنج بادۂ آوارگی، شعلۂ آہ جگر سوختگان، زنگ زدای آئینۂ وداد، وغیرہ۔ پروفیسر نذیر احمد نے اس ذیل میں تقریباً دوسو پچاس الفاظ کی فہرست درج کی ہے اور سو سے زائد ایسی تراکیب غالب کی تحریروں سے اخذ کر کے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔

غالب کی نثر نگاری پر ظہوری اور ابوالفضل کا اثر نمایاں ہے۔ نذیر صاحب نے اس طرف اپنے مختلف مضمون میں اشارے بھی کئے ہیں۔ ان کے مطابق ابوالفضل کی فارسی سرہ ہی کے زیر اثر وہ فارسی سے عربی الفاظ کے اخراج کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ اس ذیل میں انہوں نے ابوالفضل کی آئین اکبری سے مثالیں دے کر غالب کی نثر پر ابوالفضل کے طرز کے اثر کو دکھایا ہے۔ غالب کی نثر پر ظہوری کے اثر کے تعلق سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''غالب کی نثر پر ظہوری کے طرز کا اثر ہے۔ ظہوری کی معنویت کے وہ بڑے مداح تھے۔ معنویت کے ساتھ اس کے مسجع مرجز نثر کے ٹکڑے نہ صرف غالب بلکہ دوسرے ادیبوں سے داد سخن لیتے ہیں۔''

نذیر صاحب نے غالب کی نثر نگاری پر لکھتے ہوئے ملک الشعرا بہار کے اس قول کی تردید بھی کی ہے کہ 'ابوالفضل کے طرز کی پیروی نہ ہو سکی'۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر وہ (بہار) غالب کی نثر مطالعہ کرتے تو وہ اس نتیجہ پر پہونچتے کہ ابوالفضل کے طرز پر غالب نے نہ صرف کافی اضافہ کیا ہے بلکہ اسے نئے طرز پر ڈھالا ہے جو ان کا اپنا مخصوص اسلوب بن گیا ہے''۔

اس میں شک نہیں کہ غالب نے اپنی شاعری کی بنیاد مغل دور کے شعری سرمایہ پر رکھی تھی۔ انہوں نے فارسی کے سبھی بڑے شاعروں سے استفادہ کیا تھا لیکن ان میں سے کسی کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، حزین اور بیدل کو خصوصیت سے پڑھا تھا لیکن جیسا کہ خود غالب کی متعدد تحریروں سے واضح ہے انہوں نے قصیدہ میں عرفی اور غزل میں نظیری کی پیروی کی ہے۔ نذیر صاحب نے مختلف شواہد کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے مجموعی کلام پر سب سے گہرا اثر ظہوری کا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

۱- جہاں بھی ظہوری، نظیری اور عرفی کا ذکر کرتے ہیں وہاں اول الذکر کو ممتاز کر دیتے ہیں۔ اس کی تائید میں انہوں نے درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں:

دامن از کف کنم چگونه رہا

طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح روان معنی را

آن ظہوری جہان معنی را

آن کہ از سرفرازی قلمش

آسمان ساست پرچم علمش

طرز اندیشہ آفریدۂ اوست

در تن لفظ جان دمیدۂ اوست

اس کے علاوہ ان ابیات سے بھی غالب کے ظہوری سے فیض پذیری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے:

غالب از صہبای اخلاق ظہوری سرخوشیم

پارۂ بیش است از گفتار ما کردار ما

مارا مدد ز فیض ظہوری ست در سخن

چون جام بادہ را تبہ خوار خمیم ما

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب

رگ جان کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

ان ابیات سے صاف ظاہر ہے کہ ظہوری نے حقیقی معنوں میں مرزا کے ادب اور انشا پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے۔

نذیر صاحب جب غالب کی فارسی قصیدہ نگاری پر مضمون لکھ رہے تھے تو دوران تحقیق انہیں احساس ہوا کہ اب تک فارسی قصیدہ نگاری پر اس درجہ کا کام نہیں ہوا جس کا یہ فن مستحق ہے۔ لہذا انہوں نے پہلے فارسی قصیدہ نگاری پر کتاب لکھی اور پھر غالب کی قصیدہ نگاری کا اس کی روشنی میں جائزہ لیا۔ اس سے نذیر صاحب کے کسی بھی موضوع پر تحقیق سے متعلق سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے۔

نذیر صاحب غالب کو فارسی قصیدہ نگاری کی تاریخ میں کوئی نمایاں مقام دیتے تو نظر نہیں آتے لیکن اس میدان میں غالب کی جو خصوصیت ہے اس کی طرف ضرور نشاندہی کی ہے

۔یہ وہ خصوصیات ہیں جو غالب کو دوسرے قصیدہ گو شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔غالب کے قصائد کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے قصائد مضمون آفرینی، نازک خیالی، اور جدت ادا کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔اس بنا پر یہ قصیدے اکثر غزل کے حدود میں داخل ہوگئے ہیں''۔

غالب نے اپنی جدت طبع کے سبب بیشمار نئی نئی تراکیب ایجاد کی جن سے یقیناً زبان کا دامن وسیع ہوا ہے۔نذیر صاحب نے غالب کے فارسی قصائد سے سیکڑوں ایسی مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

پردۂ رسم پرستش، حسن بی نشان، پویۂ دشت خیال، کاسۂ دریا دکان، سومنات خیال، سپیدہ روی سیہ کار، نطع ادیم، خار چاک، وغیرہ

'قسمیہ' فارسی قصیدہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔اور اس پر بڑے بڑے قصیدہ گو شعرا نے طبع آزمائی کی ہے مثلاً انوری، عرفی، وغیرہ۔نذیر صاحب کے مطابق غالب نے عرفی سے متاثر ہو کر سوگند نامہ لکھا جو حضرت امام حسین کی مدح میں ہے۔غالب نے اس میں ایجاد معانی اور مضمون آفرینی کی عمدہ مثال پیش کی ہے، اس قصیدے کے چند ابیات ملاحظہ ہوں:

ستم رسیدہ اماما بخون طپیدہ سرا
کہ کربلا ز تو گردیدہ قبلہ گاہ بلاد
بہ رہبری کہ گدایان کوی غفلت را
ز نور شرع چراغی بہ رہگذار نہاد
بہ رہروی کہ گراید بسایۂ شمسیر
بہ تشنۂ کہ ستیزد بدشنہ فولاد

نذیر صاحب نے غالب کے قصائد کو محض قدما کی تقلید اور پیروی سے الگ کر کے دیکھا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

اس مقالہ میں نذیر صاحب کی غالب شناسی کے تعلق سے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی

گئی ہے وہ محض مشتی ازخروار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نذیر صاحب نے کئی ماہرین غالبیات سے زیادہ کام کیا ہے اوران کے کام کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ لہذا غالب شناسی کے میدان میں نذیر صاحب کوایک اہم مقام دیا جاسکتا ہے۔

جمشید خان

فرہنگِ قوّاس تصحیح پروفیسر نذیر احمد: ایک تعارف

ہندوستان کے قرون وسطی کی ایک امتیازی خصوصیت فارسی زبان وادب کی ترقی وفروغ ہے۔ اس زبان وادب کا خوب صورت سرچشمہ آج بھی جاری وساری ہے۔ گزری ہوئی تقریباً ایک صدی میں ہندوستان میں ایسے نامور ونابغۂ روزگار محققین اور ناقدین پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے فارسی زبان وادب کے فروغ میں گران قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اپنی ان علمی وادبی خدمات کے پیشِ نظر عالمی شہرت یافتہ ہیں۔ ان محققین اور اساتذہ گرامی نے کلاسیکل فارسی متون کی تصحیح، تراجم، فارسی ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر تصانیف اور بیش بہا تحقیقی مقالات کے ذریعے فارسی ادب کی جو خدمت کی ہے وہ بے مثال اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

فارسی ادب کے ان محققین وناقدین میں ایک مؤقر ومعتبر نام پروفیسر نذیر احمد کا ہے۔ نذیر صاحب ایک کثیر التحریر مصنف تھے آپ کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ ''کارنامۂ نذیر''[۱] سے بخوبی لیا جاسکتا ہے جسے آپ کی بیٹی پروفیسر ریحانہ خاتون صاحبہ نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں نذیر صاحب کے ہم عصروں اور شاگردوں نے آپ کے بارے میں اپنے

احساسات وتاثرات بیان کیے ہیں۔ جن میں ایرانی اساتذہ بھی شامل ہیں۔ بلاشبہ ان معاصرین نے آپ کو ایک بلند پایہ محقق وناقد کی حیثیت سے جانا اور سمجھا ہے اور آپ کی بزرگی ومقبولیت کا فخریہ طور پر اعتراف کیا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد ۳ر جنوری 1915ء کو مشرقی اتر پردیش کے ضلع گونڈہ کے ایک گاؤں کولھی غریب میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں کرسچین کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۳۹ء میں بی.اے. (آنرز)، ۱۹۴۰ء میں ایم.اے. (فارسی)، ۱۹۴۵ء میں پی.ایچ.ڈی. (فارسی)، ۱۹۵۰ء میں ڈی.لٹ (فارسی) اور ۱۹۵۶ء میں ڈی.لٹ (اردو) کی اسناد حاصل کیں۔ اسی دوران 1955ء میں حکومت ہند کے وظیفے پر ایران جانے کا موقع ملا۔ وہاں تہران یونیورسٹی سے پہلوی اور جدید فارسی میں ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ریڈر مقرر ہوگئے۔ ۱۹۶۰ء میں پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اگست ۱۹۷۸ء میں فارسی زبان وادب کی خدمت کے لیے صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے انہیں سند توصیف پیش کی گئی۔ اسی سال غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے انہیں فخر الدین علی احمد ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۸۷ء میں حکومت ہند کی جانب سے انہیں پدم شری کا خطاب عطا کیا گیا۔ اسی سال امیر خسرو سوسائٹی امریکا نے انہیں نذر امیر خسرو ایوارڈ پیش کیا۔ ۱۹۸۹ء میں تہران یونیورسٹی نے انہیں سند اعزازی عطا کی۔ اسی سال ایران کے پہلے عالمی، ادبی اور تاریخی ''محمود افشار ایوارڈ'' کے مستحق قرار دیے گئے۔

پروفیسر نذیر احمد مختلف علمی وادبی رسائل وجرائد کی مجلس ادارت سے بھی وابستہ رہے مثلاً ایران شناسی (تہران) انڈو ایرانیکا (کلکتہ) معارف (اعظم گڑھ) بیاض (دہلی) ہسٹری آف سائنس اینڈ میڈیسن (نئی دہلی) اور قند پارسی، خانۂ فرہنگ ایران (نئی دہلی) وغیرہ۔ انہوں نے بھرپور علمی زندگی گزار کر ۱۹ر اکتوبر ۲۰۰۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی اور آپ وہیں مدفون ہیں۔[1]

پروفیسر نذیر احمد کی گوناگوں خصوصیات سے متعلق پروفیسر ماریہ بلقیس رقم طراز ہیں:

''اُردو و فارسی دانشوروں میں پروفیسر نذیر احمد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کی شناخت ایک زبردست محقق، بے نظیر نقاد، متخصص فرہنگ شناس، دکنی ادب ہند کے ماہر، کتبہ شناس، حافظ شناس اور غالب شناس کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، ایران اور تمام فارسی جاننے والے ممالک میں ہوتی ہے۔ آپ کو زبان وادب کے علاوہ موسیقی، نقاشی، مصوری، خطاطی، معماری جیسے فنون اور جغرافیائی، تاریخی، طبی اور اسلامی جیسے علوم کے علمی مباحث سے غیر معمولی دلچسپی تھی، چنانچہ آپ نے انگریزی، اردو اور فارسی زبان میں ان موضوعات پر مختلف رسالوں اور فارسی مجلوں میں کثیر تعداد میں گرانبہا اور پرارزش مقالے تحریر کیے ہیں جن کو متذکرہ بالا فنون کے ماہرین نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ آپ کے مضامین اور دیگر تصانیف پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر ریحانہ خاتون اور ڈاکٹر حسن عباس وغیرہ نے جمع آوری کی کوشش کی ہے، لیکن اس کے باوجود آپ کے تمام مضامین جو مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ان کی تمام تر بازیابی کا حق ادا نہیں ہوسکا ہے، اردو فارسی موضوعات سے متعلق مضامین کا ایک الگ مجموعہ تیار کر کے آپ کی تالیفات و تصنیفات سے جدید نسل کے طلبا کو واقف کرانا ضروری ہے۔''[۲]

ہندوستان قرون وسطی میں فارسی زبان وادب کے فروغ کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں مختلف موضوعات پر بیش بہا فارسی تصانیف سپرد قلم کی گئیں۔ ان نادر تصنیفات و تالیفات میں متعدد فرہنگیں بھی شامل ہیں۔ فرہنگ نویسی کا شمار ہندوستان اور ہندوستانیوں کی نمایاں فارسی خدمات میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے آغاز سے انیسویں صدی کے آخر تک تقریباً ایک سو بیالیس (۱۴۲) چھوٹی بڑی فرہنگیں لکھی گئیں[۳]۔ یہ فرہنگیں ہندوستانی فارسی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

فارسی لغات پروفیسر نذیر احمد کا ایک بے حد پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں لکھی گئیں قدیم فارسی فرہنگوں کو جس انداز سے تصحیح کر کے شائع کیا ہے اس سے ان کی علمی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی لغات سے پروفیسر نذیر احمد کی دلچسپی

وذوق سے متعلق پروفیسر شریف حسین قاسمی رقم طراز ہیں:

''ہندوستان میں فرہنگ نگاری محترم نذیر احمد صاحب کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہے۔ آپ نے یہاں تالیف ہونے والی چند قدیم فرہنگوں کو جس علمی انداز اور جدید تحقیقی اصول وضوابط کی بنیاد پر مرتب اور شائع کیا ہے، اس کی وجہ سے آج فارسی دنیا میں اگر آپ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے تو دوسری طرف فارسی زبان وادب کے میدان میں ہمارے تحقیقی وعلمی کام کرنے والوں کا بھرم بھی قائم ہوا ہے۔''[۹]

ایک لغت کی تصحیح اور دوسری لغات سے مقایسہ کے بعد اس کا انتقادی متن آمادہ کرنا ایک نہایت مشکل ودقیق علمی کام ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے اس کام کو بہ حسن وخوبی انجام دیا ہے۔ ان کی تصحیح کردہ لغات میں ایک اہم لغت فرہنگِ قواس ہے۔ یہ فرہنگ فخر الدین مبارک شاہ قواس نے سلطان علاء الدین خلجی (۱۳۱۵-۱۲۹۵ء) کے عہد میں مرتب کی۔ فخرِ قواس نے اس فرہنگ کے ذریعہ ہندوستان میں فرہنگ نویسی کی بنیاد ڈالی ہے۔[۱۰] اس فرہنگ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ بعد میں لکھی گئیں فرہنگیں جیسے دستور الافاضل، زفان گویا، لسان الشعراء، ادات الفضلا وغیرہ نے اس فرہنگ سے استفادہ کیا ہے۔

فخر قواس کے احوال کے بارے میں اطلاعات دستیاب نہیں ہیں۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں فخرِ قواس کو عہد علائی کے استاد شاعروں میں شمار کیا ہے:

''......صدر الدین عالی وفخر قواس وحمید الدین راجہ ومولانا عارف وعبید حکیم وشہاب انصاری وصدر بستی کہ از شعرای عصر علائی بودند وای از دیوان عرض مواجب شاعری می یافتند وہر یکی را در نظم شیوۂ وطرزی بود ودیوانہا دارند ونظم ونثر ایشان براوستادی وشاعری ایشان حاکی است''[۱۱]

مولف نے اس فرہنگ کے مختصر دیباچے میں اس لغت کی وجہ تالیف اور مختلف حصوں میں اس کی درجہ بندی کا ذکر کیا ہے۔ وجہ تالیف سے متعلق فخرِ قواس نے یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ ایک دن وہ دوستوں کے ساتھ ہم مجلس تھے تب انہوں نے قدیم متون کے پڑھنے میں حائل

دشواریوں کا ذکر کیا اور خصوصاً شاہنامہ کی مثال پیش کی۔ انہوں نے فخرِ قوّاس سے ایک جامع فرہنگ لکھنے کی درخواست کی جسے انہوں نے قبول کرلیا اور یہ فرہنگ مرتب کی:

"......روزی در انجمنی نشسته بودم. یارانِ همدل وہم منش گرد آمده بودند...... روزی خواندن کارنامه در دل ایشان راه یافت. شاہنامه که بهترین نامه ہاست، پیش آوردند ...... دوستی روی به من آورد و گفت...... مارا ازین زبان بهره مند کن...... درِ پوزش را بستم و سخن را در سخن پیوستم...... پس ازآن جوش گرفتند که آنچه زبان پارسی وپہلوی است، می باید که ہمه را یکجا کنی وترزفان بنویسی تاہر کسی ازین زبان بہره ای گیرد...... مرا چون از گفت او...... گریز نبود خشنودشدم ودرِ بستوه واستوه را برخود بستم وخاست منش واندیشهٔ دل در آن پیوستم تافرہنگ نامه باہم کنم. نخست شاہنامه را که شاه نامه ہاست، پیش آوردم واز سرتاپا بخانه فرو خواندم، آنچه از سخن پہلوی بودهمه راجداگانه بر کاغدی بنوشتم. فرہنگ نامه ہای دیگر...... ہمه را فرونگریستم ویگان یگان درخانهٔ کاغذ نگار آوردم، وآنرابخش بخش و گونه گونه و بہره بہره کردم"[۳]

فرہنگِ قوّاس کوفرہنگ نامہٴ پنج بخش کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ فرہنگ پانچ بخش یعنی حصوں پر مشتمل ہے۔اس کے چار بخش مزید حصوں یعنی گونہ اور بہرہ میں تقسیم کیے گئے ہیں۔اس فرہنگ کی ترتیب الفبائی نہیں بلکہ موضوعات کی شکل میں ہے جیسے پھول، درخت، جانور، پرندے، کھانے پینے کی اشیاء، بیماریاں، جنگی سازوسامان وغیرہ۔ یہ موضوعات درج ذیل ہیں:

بخش نخستین

گونهٔ اوّل : درنام خدای تعالی

گونهٔ دوّم : درنام چیزہای پراکنده

گونهٔ سوّم : درنام آسمان وستارگان وماه ها

گونهٔ چهارم : درنام آتش وباد و آب وخاك

گونهٔ پنجم : درنام چیزہای میان آسمان و زمین

بخش دوّم : درنام چیزهای بربسته که آنرا جماد خوانند

بخش سوّم : درنام چیزهای بربسته که آنرا نبات خوانند

گونهٔ نخست : درنام گیاه هاوآنچه تنه ندارد

گونهٔ دوم : درنام گل وگلزار

گونهٔ سوم : درنام درختان تنه دار

گونهٔ چهارم : درنام کشتها و غله ها

بخش چهارم : درنام جانوران پرنده وخزنده وجنبده

گونهٔ نخست : درنام پرندگان بزرگ

بهرهٔ نخست : درنام پرندگان بزرگ که به ہوا پرند

بهرهٔ دوّم : درنام پرندگان خرد

گونهٔ دوّم : درنام جانوران آبی

گونهٔ سوّم : درنام خزندگان زمین

گونهٔ چهارم : درنام چارپایان

گونهٔ پنجم : درنام آدمی

بهرهٔ نخست : دراندام آدمی

بهرهٔ دوم : درنام آدمیان وگرد ایشان

بخش پنجم : درنام چیزهای که ازکار آدمی است وآدمی را بکار آید

گونهٔ نخست : درنام خانه هاو جایها

گونۀ دوم : درنام آوندها

گونۀ سوّم : درنام خورد نیها

گونۀ چهارم : درنام پوشید نیها

گونۀ پنجم : درنام بیماری ها و آنچه بدان ماند

گونۀ ششم : درنام جنگ و جنگ آوران و سازهای جنگ

گونۀ هفتم : درنام سازکار کارگران

گونۀ هشتم : درنام تفاریق ہر چیزی که باشد

گونۀ نہم : درکرد بطریق مصدر[1]

فرہنگ قواس کا منحصر بہ فرد نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ پروفیسر نذیر احمد اس نسخے سے متعلق رقم طراز ہیں:

''فرہنگ قواس کا محض ایک ناقص نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتاب خانے میں محفوظ ہے (کرزن کلیکشن نمبر ۵۱۶)، اس نسخے میں ۶۸ ورق ہیں، ہر صفحے پر ۱۸ سطریں ہیں، خط نسخ میں ہے، سال کتابت اور کاتب دونوں معلوم نہیں، شروع کی چند سطریں غائب ہیں جو منقول عنہ کی غماز ہیں، آخر میں چند ورق غائب ہونے کا پتا چلتا ہے، بخش پنجم کا آخری ''گونہ'' جو مصادر پر مشتمل تھا وہ پورے کا پورا غایب ہے، درمیان میں بعض گمنام مقام پر جگہ چھوٹی ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس نسخے پر نسخہ ھذا کا مدا تھا، وہ بھی ناقص تھا، راقم حروف نے اس نسخے کا انتقادی متن مع توضیحی حواشی اور تفصیلی مقدمے کے بنگاہ نشر کتاب تہران سے ۱۳۵۳ شمسی میں شائع کر دیا۔''[2]

پروفیسر نذیر احمد کو ایشیاٹک سوسائٹی کے اس نسخے کی تصحیح میں جو دشواریاں پیش آئیں اس کا ذکر انہوں نے اپنے مقدمے میں کیا ہے۔ بقول نذیر صاحب اس نسخے کی کتابت میں کاتب نے بہت غلطیاں کی ہیں۔ شاید ہی کوئی سطر ایسی ہو جس میں اشتباہ نہ ہو۔ مثلاً اگر لفظ صحیح ہے تو معنی غلط ہیں۔ اگر لفظ اور معنی دونوں صحیح ہیں تو شہادت کے طور پر دیا گیا شعر درست نہیں

ہے۔ جن الفاظ کی شرح دی گئی ہے بعض موقعوں پر ان کی کتابت میں غلطیاں ہوئی ہیں اور دوسری فرہنگوں جیسے لغت فرس، صحاح الفرس، دستور الافاضل، معیار جمالی، ادات الفضلا، زفان گویا، بحر الفضائل، شرفنامہ، موید الافضلا وغیرہ کی مدد سے ان کی تصحیح کی گئی ہے۔ ایک ناقص اور منحصر بہ فرد نسخے سے علمی و انتقادی متن آمادہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس فرہنگ کا صحیح اور درست متن آمادہ کرسکوں[۳۳]

فرہنگ قواس کا ایک مکمل اور درست انتقادی متن آمادہ کرنے کی خواہش نذیر صاحب کے دل میں باقی رہی اور وہ اس جستجو میں رہے کہ اس فرہنگ کا مزید کوئی نسخہ دریافت ہو۔ بالآخر جب کراچی میوزیم کے خطی نسخوں کی فہرست مولفہ سید عارف نوشاہی آپ کی نظر سے گزری تو آپ نے اس میں فرہنگ قواس کے نسخے کا تعارف پایا۔ یہ درحقیقت نسخوں کا ایک مجموعہ (N. M. ۱۹۷۲-۱۰۶) تھا جس میں چار فارسی فرہنگیں فرہنگ قواس، فرہنگ مختصری (ناشناس)، فرہنگ زفان گویا، فرہنگ لسان الشعراء اور ترجمہ امرت کنڈ شامل تھیں، پروفیسر نجم الاسلام، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی کی مدد سے اس نسخے کا عکس نذیر صاحب کو حاصل ہوگیا[۳۴]

۱۹۹۲ء میں کراچی میوزیم میں فرہنگ قواس کا کشف شدہ نسخہ مکمل تھا۔ پروفیسر نذیر احمد نے اس نئے نسخے کی بنیاد پر پرانے نسخے سے مقایسہ کے ساتھ ایک نیا تنقیدی متن تیار کیا ہے جس سے پرانے نسخے کی بہت سی غلطیاں دور ہوگئیں ہیں۔ مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے کا آخری حصہ افتادہ تھا جو مکمل ہوگیا۔ کچھ الفاظ جو پرانے نسخے میں موجود نہیں تھے، بڑھائے گئے۔ کچھ لفظوں کی تصحیح کی گئی۔ کچھ اشعار میں اضافہ ہوا۔ کچھ اشعار کی تصحیح کی گئی۔ اس فرہنگ کا یہ نیا تیار کردہ تنقیدی متن رضا لائبریری، رامپور سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا گیا ہے۔

نسخہ کراچی کے بارے میں پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں :

''فرہنگ قواس لی کے نسخۂ کراچی کی کتابت کی تاریخ معلوم نہیں، اور جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ نسخہ ایک مجموعے میں شامل ہے جس کا آخری حصہ ناقص ہے، اس لیے کتابت کی تاریخ

معلوم نہ ہوسکی، دسویں کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل میں اس کی کتابت ہوئی ہوگی، خط نسخ میں ہے، لیکن یہ نسخ مائل بہ نستعلیق ہے، نسخہ سوسائٹی سے زیادہ خوانا ہے، لیکن عام نسخوں کی طرح کتابت کی بے پناہ غلطیاں ہیں، فرہنگ کی کتاب نادر الفاظ کا بڑا ذخیرہ ہوتی ہے، جو اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی کے لیے دردسر کا موجب ہوتا ہے تو وہ عام کاتب کے بس کا یہ روگ کیونکر ہوسکتا، پھر قدیم اور غیر معروف شعرا کے اشعار کی صحیح کتابت جتنی مشکل ہے وہ اہل دانش پر بخوبی روشن ہے، غرض کراچی کا نسخہ ان تمام خواص کا حامل ہے، اور حق بات تو یہ ہے کہ محض ایک نسخے سے صحیح متن کا تعین نہایت مشکل مسئلہ ہے، لیکن چونکہ ایک اور نسخہ مل گیا ہے اور بعد کی بعض فرہنگیں قواس ہی کے زیر اثر لکھی گئیں، ان امور کی بنا پر اب فرہنگ قواس کا ایک معتبر نسخہ تیار ہوسکتا ہے۔"[1]

پروفیسر نذیر احمد نے فرہنگ قواس کا انتقادی متن آمادہ کرنے میں کتنی محنت اور جانفشانی سے کام کیا ہے اس کی ایک عمدہ مثال یہ بھی ہے کہ آپ نے فخر قواس کے ذریعہ بعض اشعار کے انتساب میں جو غلطی ہوئی ہے اسے اپنے دقیق و عمیق مطالعہ سے درست کر دیا ہے۔ مثلاً نذیر صاحب نے اپنے مقدمے میں مختلف اشعار کا حوالہ پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ بطور مثال پیش کیا گیا بیت شاہد درحقیقت کس شاعر کا ہے جیسے یہ شعر عسجدی کا ہے، عنصری کا نہیں، سوزنی کا ہے، رودکی کا نہیں۔

فرہنگ قواس میں ہندی زبان کے کچھ الفاظ بھی شامل ہیں جو اُس دور میں رائج تھے جیسے بہتل، کھیل، جھج کنیر، یکہ، گالہ، لدو۔

اس فرہنگ میں کچھ ہندوستانی شاعروں جیسے تاج ریزہ، شہاب مھمرہ، عوفی، ناصری کے اشعار شامل ہیں۔ ان اشعار کی مدد سے کچھ ادبی اور تاریخی مشکلات حل کرنے میں مدد ملی ہے جیسے تاج دبیر، تاج، تاج ریزہ ایک ہی ہیں۔

فرہنگ قواس سے چند الفاظ بطور نمونہ پیش ہیں۔

افروشہ : ایک قسم کا حلوہ

کلنبہ	:	لڈو
بتکوب	:	دودھ اور کریم وغیرہ سے تیارہ شدہ غذا
کاسگینہ	:	ایک سبز پرندہ
چکاوک	:	سرخاب
سپاروک	:	کبوتر
وال	:	دم دار مچھلی
شیم	:	ایک قسم کی مچھلی
غوش	:	ایک قسم کی سخت لکڑی
فیلک	:	بدخشانی تیر
بلونک	:	شمشیرِ چوبین
شگاہ	:	تیردان
مرزہ	:	چراغ دان
نسر	:	سائبان
بوفروش	:	عطار
خنشان	:	مبارک
شوب	:	دستار
فنجا	:	دمہ کی بیماری
پچشک	:	طبیب

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرہنگ قواس ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ میں تالیف ہوئی ایک

اہم فرہنگ ہے۔ فخر تو اس کی اس علمی کاوش میں کشش ضرور تھی جس کے نتیجے میں بہت جلد اس فرہنگ کو شہرت نصیب ہوئی اور بعد کے مولفین نے اپنی لغات تالیف کرنے میں اس فرہنگ سے استفادہ کیا۔ نذیر صاحب نے اپنی علمی بصیرت اور جدید تحقیقی اصول وضوابط کی روشنی میں جس عمدہ انداز میں اس فرہنگ کی تصحیح کی ہے وہ تصحیح متن پر کام کرنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ و نمونہ ہے۔

سرفراز احمد خاں

فارسی ادبیات کا شارح و مبلغ: نذیر احمد

پروفیسر نذیر احمد ان بین الاقوامی عظیم المراتب لوگوں میں سے تھے جنہوں نے تاریخ کے صفحات پر لافانی نقوش ثبت کئے ہیں اور آج ہم اسی عظیم المرتبت شخصیت کی یاد میں یہاں جمع ہوئے ہیں۔

میں اپنے مقالہ کا آغاز علامہ شبلی کے چند اشعار سے کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے فارسی زبان وادب کے مایۂ ناز محقق استاد الاساتذہ جناب پروفیسر نذیر احمد کو پدم شری کے خطاب سے نوازے جانے پر کہے تھے:

ادیب و عالم و نقاد فن نذیر احمد
متاع فکر و وقار سخن نظیر احمد
نگاهدار روایات سعدی و حافظ
امین غالب شیرین دھن نذیر احمد
نصیب ہی سے جو ملتی ہے تشنہ کاموں کو
خوشا کہ ہیں وہی درد کہن نذیر احمد

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے تلمیذ خاص، مختلف علمی کمالات کے حامل، ایرج افشار، سعیدی سیرجانی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سید جعفر شہیدی کی صحبتوں سے فیض یافتہ، دانش گاہ تہران، دانش گاہ اسلامی علی گڑھ اور دانش گاہ لکھنؤ کے تعلیمی ماحول سے آراستہ و پیراستہ، پروفیسر شعیب اعظمی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر آذرمیدخت صفوی اور پروفیسر ماریہ بلقیس کے سنگ میل، صدر ایوارڈ، غالب ایوارڈ، خسرو ایوارڈ، یونیسکو ایوارڈ اور میر ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے والے اردو ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی ادب کی تزئین اور آرائش میں ہمہ تین مصروف، حافظ شناسی اور نادر و نایاب نسخوں کی بازیافت اور نقد و تدوین کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ایک درجن کتابوں اور سیکڑوں پر مغز مقالوں کے مصنف، ادارہ فکر و نظر کے اساسی سکریٹری، شعبہ فارسی علی گڑھ کے سابق سربراہ، ڈین اور پروفیسر ایمرٹس اور نہ جانے کتنے پنہاں خوبیوں کے مالک، ایسے ہی عظیم اور جلیل القدر شخص کو دنیائے ادب پروفیسر نذیر احمد کے نام سے جانتی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد اپنے بے مثال علمی، تحقیقی، تاریخی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے آج دنیائے فارسی میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہندستان کے فارسی نوابغ کی اگر مختصر فہرست بھی تیار کی جائے تو اس میں نذیر احمد صاحب کا ایک اہم مقام ہوگا۔ ان کی تحقیقات کو ایران، افغانستان، پاکستان، مرکزی ایشیا اور ترکی میں وہاں کے ممتاز دانش ور اور ادیب بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب کی کتاب سے ایک مختصر اقتباس یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جو بہت مختصر ہے لیکن پروفیسر نذیر صاحب کی شخصیت کا بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر نذیر صاحب درحقیقت فارسی دنیا کی آبرو اور فارسی زبان و ادب پر کام کرنے والے دانشوروں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ آپ کا شمار بجا طور پر فارسی دنیا کے مفاخر میں کیا جاتا ہے۔ ایران و ہندستان کے تقریباً تمام علمی اور ادبی مراکز نے آپ کی علمی بصیرت کو سراہا ہے اور مختلف انداز سے آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس طرح اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ آپ کی شخصیت فارسی دنیا میں باعث فخر ہے''۔ (۱)

اس گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے میں علی گڑھ کے ایک اور معتبر محقق اور نذیر صاحب کے ہم عصر

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رائے نقل کرنا چاہتا ہوں جو نذیر صاحب قبلہ مرحوم کی شخصیت اور ان کے فن کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

''فارسی زبان و ادب کے عالموں اور محققوں میں پروفیسر نذیر احمد صاحب کا نام ہندستان میں کمال عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک ہندستانی کے لیے اس سے زیادہ اور فخر و مباحات کا موقع اور کیا ہوسکتا ہے کہ اہل زبان یعنی ایرانی اور افغانی بھی ان کے علم و فضل اور معیار تحقیق کا لوہا ماننے پر مجبور ہوں۔ مکاتیب سنائی، دیوان سراجی، فرہنگ قواس، دیوان حافظ، دستور الافاضل اور نقد قاطع برہان ایسے وقیع کارنامے ہیں جو نذیر صاحب کی دقت نظر اور اصابت رائے، کاوش اور محنت پژوہی اور دیدہ وری اور واشگاف بصیرت پر محکم طور پر دلالت کرتے ہیں اور کسی بھی عالم اور محقق کے لیے مایہ صد افتخار کہے جاسکتے ہیں۔ مضامین اور کتابچے ان کے علاوہ ہیں اور ان گنت ہیں''۔(۲)

ان کے حالات زندگی اور ابتدائی تعلیم کا کوئی مستند ماخذ ہمیں دستیاب نہیں ہوا البتہ ان کی دختر نیک اختر پروفیسر ریحانہ خاتون صاحبہ کی کتاب کارنامۂ نذیر میں ہمیں جو تفصیلات ملتی ہیں وہ نہایت ہی معتبر اور مستند ہیں کیونکہ ذاتی مشاہدات کی بنا پر پروفیسر صاحبہ نے اسے قلم بند کیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا وکی پیڈیا میں ہمیں جو اطلاعات ملتی ہیں میں یہاں مختصر طور پر نقل کرنا چاہتا ہوں۔

" Professor Nazir Ahmad was born on 3rd January, 1915 in a village Kalahi Gharib, Gonda (U.P). After completing his primary education from this village, he successfully completed his middle school examination in 1930 and moved to Gonda city for higher education. After completing his high school from Gonda, he joined Christian college in Lucknow. He completed his B.A in Persian from Lucknow University. He completed his M.A.(Persian) in 1940

with first division and recieved two gold medals and fellowship for higher studies.

Professor Nazir Ahmad enrolled himself for Ph.D under the guidance of Prof. Masood Hassan Rizvi Adib and finished his research on Zahuri Tarshezi and recieved his doctorate in 1945. His interest in research convinced him to register for D.Lit in Lucknow university. He focussed his research on Persian poets of Adil Shah and submitted his thesis for D.Lit and got awarded D.Lit from Lucknow university in 1950. Same year he appointed Lecturer in Lucknow university. In March, 1957 the then Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University Col. Bashir Zaidi appointed Professor Nazir Ahmad as assistant director of Aligarh Tahrikh-e Urdu Adab and later in August 1958 he was appointed as reader in the in the department of Persian in A.M.U. In 1960 when Prof. Zia Ahmad Baduini of Persian died, Dr. Nazir Ahmad was appointed as professor and chairman Department of Persian of A.M.U. This was the begining of a versatile genious of Persian language and literature who is known as Nazir Ahmad.(3)

تحقیق وتدوین کے میدان میں نادر ونایاب کارناموں کو پیش کرنے کے ساتھ ہی وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ مجھ ناچیز اور ذرہ حقیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے نہ صرف ان کو دیکھا ہے بلکہ ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ سر سید نگر میں ان کے گھر میں اکثر وبیشتر جایا کرتا تھا اور ان کی علمی گفتگو سے مستفید ہوتا تھا۔ وہ اکثر یہ دریافت کرتے تھے کہ آپ آج کل کیا کر رہے ہیں میں نے ان سے ایک مرتبہ یہ بتایا کہ میں آج کل تذکرہ عرفات العاشقین پر کام کر رہا ہوں تو فوراً انھوں نے وہ سارے نسخے بتا دیے جو ہندستان اور دنیا کی دوسری لائبریریوں میں موجود ہیں۔ طالب علمی

کے زمانے میں وہ اکثر شعبہ فارسی کے سمینار لائبریری میں آکر ضخیم کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہتے تھے۔انھیں مصروف کار دیکھ کر نوجوان نسل سبق لیتی تھی۔ میں یہاں پروفیسر ماریہ بلقیس صاحبہ کی وہ بات یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے والد بزرگوار کے حسن اخلاق کے سلسلے میں نقل کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''آپ کے بلند اخلاق کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ ایک سمینار میں حضرت نظام الدین تشریف لائے۔ یہ سمینار خواجہ حسن ثانی نظامی نے کروایا تھا واپسی میں ہدیتہً آپ کو کچھ پیسے کی پیش کش کی گئی جو آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میں ایسے عظیم پایہ انسان کے سمینار میں شرکت کروں یہ میری خوش قسمتی ہے لیکن اس کے لیے پیسہ لوں یہ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔(۴)

ایسی سحر انگیز شخصیت تھی پروفیسر نذیر احمد صاحب کی۔وہ اپنے شاگردوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔انھوں نے اپنی دریا دلی اور فیض سے بے شمار لوگوں کی زندگیاں سنوار دیں جو آج کل یونی ورسٹیوں میں اعلی عہدوں پر فائز ہیں اور بہت سے لوگ تو ریٹائر بھی ہو چکے۔ یہ تھے ان کی ذاتی شخصیت کے کچھ پہلو۔اب ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کر رہا ہوں جو مجھ ناچیز کے لیے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔پروفیسر نذیر احمد صاحب نے پٹے پٹائے موضوعات پر نہ تو قلم اٹھایا اور نہ ہی رسم ورہ عام پھر چلنے کی کوشش کی انھوں نے بیشتر ان فارسی موضوعات پر قلم اٹھایا جو نادر و نایاب تھے۔یا جن پر کوئی مواد اردو میں نہیں ملتا۔سب سے پہلے انھوں نے ہندستان اور ایران دونوں میں نہایت مقبول شاعر ظہوری ترشیزی کا انتخاب کیا اور پہلی کتاب جو ان کی شائع ہوئی وہ انگریزی زبان میں ظہوری کے علمی کارناموں پر مشتمل تھی۔ظہوری سے ان کی دلچسپی شاید سبک ہندی کے مایہ ناز شاعر ہونے کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ظہوری نہ صرف اپنے عصر کا ممتاز شاعر تھا بلکہ نثر نگار بھی اعلی پایہ کا تھا۔سہ نثر ظہور ان کی عمدہ مثال ہے۔ظہوری پر تحقیقات سے انھیں دکنی زبان کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہوا اور اس طرح انھوں نے دکنیات کے مختلف پہلوؤں کو اپنے تحقیقات ذریعہ روشن کیا۔ساتھ ہی نورس کا انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمہ کیا ہے جو بعد میں للت کلا اکیڈمی سے شائع ہوئی۔نورس جیسی پیچیدہ اور موسیقی سے تعلق رکھنے والی کتاب کا فارسی سے انگریزی اور اردو میں ترجمہ کرنا یہ ہر انسان

کے بس کی بات نہیں۔ اس کتاب کا لوہا نہ صرف ہندستانیوں نے مانا بلکہ ایک انگریز محقق جس نے فن مصوری پر ایک مشہور کتاب تحریر کی ہے اس نے بھی پروفیسر نذیر احمد کی کتاب سے جا بجا حوالے دیے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے "Documents for the Study of Persian Painting at Bijapur by Skelton Robert"

ایک اور قابل ذکر کتاب مکاتیب سنائی ہے جو بین الاقوامی سطح پر کابل اور تہران سے الگ الگ شائع ہوئی اس سے قبل یہ کتاب رام پور سے بھی شائع ہوئی۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے سنائی غزنوی کے خطوط کو بڑی دقت اور عرق ریزی سے مرتب کیا اور اس پر ایک پر مغز مقدمہ اور تعلیقات لکھ کر شائع کی۔ بعد میں انھیں سنائی کے کچھ اور خطوط دستیاب ہوئے تو اسے بھی مرتب کر کے ادبیات علوم بشری کابل سے شائع کیا جو تین نسخہ یعنی موضع برطانیہ، دانش گاہ حیدر آباد اور دانش گاہ اسلامی علی گڑھ پر مبنی ہے۔ سنائی پر ان کی تحقیق نے اس عظیم شاعر کے فکر و فن کے بعض ایسے گوشوں کو روشن کیا جو اس وقت تک اہل علم کی نظر سے مخفی اور پوشیدہ تھے۔ مکاتیب سنائی تصوف اور صوفیوں کے حالات سے دلچسپی رکھنے والوں کو، تاریخ نگاروں، فارسی نثر کی اولین رجحان کو جاننے والوں کے لیے نہایت کارآمد اور عمدہ کتاب ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ ان کو فارسی کے نادر مخطوطات کے کھوج میں بڑی مہارت تھی یہ صلاحیت ان کی خداداد تھی۔ انھوں نے دیوان حافظ کے تین قدیم ترین نسخوں کی بازیافت ہی نہیں کی بلکہ اس کے متن کی تصحیح کر کے ایران و ہندستان دونوں سے شائع کرایا۔ اس کام میں پرویز ناتل خانلری بھی لگے ہوئے تھے لیکن پروفیسر نذیر صاحب گوئے سبقت لے گئے۔ اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ نسخہ قزوینی میں وہ غزلیں موجود نہیں ہیں جس نسخے کو ایرانی اس وقت تک بہت معتبر مانتے تھے۔ بلکہ وہ غزلیں ان حصوں میں موجود ہیں جن کو علامہ قزوینی نے الحاقی قرار دے کر دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ اس نسخے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قزوینی کی الحاقی غزلوں میں بعض اصیل غزلیں بھی شامل ہیں۔ نذیر صاحب کے اس عظیم کارنامے پر ایرانین کلچرل کونسل آف انڈیا نے انھیں حافظ شناس کے خطاب سے سرفراز کیا اور جب ۱۹۸۸ میں یونیسکو نے سال حافظ منایا تو آپ کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی۔

علم لغت سے گہری دلچسپی کی بنا پر پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ہندستان میں لکھی گئی دو قدیم ترین

لغت فرہنگ قواس اور دستور الافاضل کے متون کو تحقیق و تنقید کے جدید کسوٹی پر رکھ کر ایران سے شائع کروایا۔ فرہنگ قواس کے مقدمہ میں کاتب کی غلطیوں اور مصنف کے اشتباہ پر طویل بحث ہوئی۔ آپ کو پاکستان سے ایک بے نام کتاب ملی تھی جس میں تین فرہنگیں شامل تھیں جن میں ایک فرہنگ فرہنگ قواس بھی تھی۔ اس میں آپ کو پندرہ ایسے صفحات بھی ملے جو پہلے کے نسخوں میں موجود نہیں تھے۔ فرہنگ زفان گویا بھی آپ نے مرتب کی۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً تمام فارسی کے اہم لغت موجود ہیں اس لیے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور آپ کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا میں نے جب بھی انھیں دیکھا مطالعہ میں غرق دیکھا۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کو مرزا غالب کی طرح لغت شناسی پر ناز تھا لیکن غالب فارسی داں تھے لغت شناس نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاطع برہان میں تحقیق کی بہ نسبت مناظراتی انداز اور ڈائیلاڈکشن زیادہ ہے۔ غالب کی لغت شناسی پر پروفیسر نذیر احمد کی کتاب نقد قاطع برہان غالبیات میں ایسے پنہاں گوشے کو اجاگر کرتی ہے جس سے آج فارسی کا کوئی دوسرا محقق جسارت نہیں کر سکا۔

لغت شناسی کی طرح ہی آپ کو قدیم فارسی شعرا کے دواوین کو پڑھنے اور تصحیح اور تدوین کرنے کا بہت شوق تھا اسی شوق اور جستجو کی بنا کر ہندستان کے دو قدیم شعرا عمید لوئیکی اور سراجی خراسانی کے دیوان کو نہ صرف مرتب کیا بلکہ تصحیح بھی کی۔ سراجی خراسانی کا دیوان سعید نفیسی کے پاس تھا جو انھوں نے نذیر صاحب کو عاریتاً دیا تھا۔ سراجی فارسی کا اولین ہندستانی صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس لیے تاریخی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ عام خیال یہی تھا کہ اس کا دیوان ناپید ہے لیکن اس دیوان کے انکشاف سے فارسی شاعری کا دامن اور وسیع ہوا۔ یہ کام آسان نہ تھا لیکن نذیر صاحب نے بہت مستقل مزاجی اور دیدہ ریزی سے اس کام کو انجام دیا جو شاید وہی کر سکتے تھے۔ اسی طرح عمید لوئیکی کا دیوان بھی آپ نے مرتب کرا کر لاہور سے شائع کرایا۔ اس میں عمید کے اشعار اور کچھ نعتیں ہیں۔

مندرجہ بالا تمام تحقیقی اور پر مغز کارناموں کے علاوہ پروفیسر نذیر صاحب نے فارسی زبان و ادب پر سیکڑوں مضامین تحریر فرمائے۔ ان کے بعض علمی مقالات سو صفحات سے بھی زیادہ ہیں یہ سبھی مقالات مختلف مجلات اور دنیا کے تمام فارسی، اردو اور انگریزی کے ادبی رسالات میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ مقالات تو ان کے عزیز شاگرد مرحوم کبیر احمد جائسی صاحب نے شائع کیے

تھے، اس کے علاوہ نذیر صاحب کی صاحب زادی پروفیسر ریحانہ خاتون نے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے تمام مقالات کتابی صورت میں دوبارہ شائع کیے جائیں تاکہ علم وادب کے لولوولمرجان بکھرنے سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ کام غالب انسٹی ٹیوٹ بخوبی انجام دے سکتا ہے اور دے بھی رہا ہے۔ درحقیقت نذیر صاحب قبلہ مرحوم

نے غالب انسٹی کی جو خدمات انجام دی ہیں اس کا مناسب اعتراف یہی ہوگا کہ یہ ادارہ ان کے تمام تحقیقی مقالات کو کلیات کی شکل میں شائع کردے۔

حواشی:

۱۔ پیش لفظ، کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، ص ا، نئی دھلی ۱۹۹۵۔

۲۔، کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، ص ۳۷، نئی دھلی ۱۹۹۵۔

۳۔ Encyclopaedia Wikipaedia, In context of Prof. Nazir Ahmad,

۴۔، کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون،، نئی دھلی ۱۹۹۵۔

کتابیات:

۱۔ فارسی قصیدہ نگاری، نذیر احمد، ادارۂ علوم اسلامیہ، علیگڑہ، ۱۹۹۱

۲۔ فرہنگ معین، چاپ تہران۔

۵۔ مکاتیب سنایی، سنایی غزنوی،

۶۔ برھان قاطع، مولوی محمد حسین، نول کشور پرس، لکھنو، ۱۸۷۹

۷۔ دیوان ظہوری، ظہوری، نول کشور پرس، کانپور، ۱۸۹۷

۸۔ دیوان حافظ، ڈاکٹر نذیر احمد وجلال نئی، تہران، ۱۳۵۰ش

۹۔ فرہنگ فارسی، دکتر محمد معین، انتشارات کبیر، تہران، ۱۳۷۱ش

۱۰۔، کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون،، نئی دھلی ۱۹۹۵۔

مہتاب جہاں

چند کتابوں کے حوالے سے استاد نذیر احمد

فارسی زبان کہنے کو تو ایران و افغانستان کی مادری زبان ہے اور غیر ملکی حکمرانوں کی بدولت ہندوستان میں وارد ہوئی۔ مگر ہندوستان نے جس قدر اس زبان کی حکمرانوں اور بغیر حکمرانوں کے زیر اثر رہ کر بھی اس کی پشت پناہی کی، اس کے شواہد مختلف شکلوں میں ہندوستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جیسے کتابخانوں، عبادت خانوں، خانقاہوں، میوزیموں، آرکائیوز وغیرہ۔ یہ تو ہوئی بات مردہ جنسوں کی۔ کیونکہ کتابوں کو جب تک اُن پر پڑی دھول کو صاف کرکے پڑھا نہ جائے، ان سے متعلق کچھ بات نہ کی جائے، ان کو منظر عام پر نہ لایا جائے تب تک وہ مردہ چیزوں میں ہی شمار ہوتی ہیں۔ ان مردہ اشیاء کو زندہ کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو خدا کا شکر ہے کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں بے شمار عالموں، دانشمندوں، محققوں نے فارسی کو زندہ رکھنے اور اس کے احیاء کے لیے مسلسل جدوجہدیں کیں ہیں۔ اور ہر ایک نے اپنے طور پر مختلف طریقوں سے اور اپنے رجحان کے مطابق کام کیے ہیں۔ ان حضرات میں چند نام سرفہرست ہیں۔ جنہوں نے بیسویں صدی کے وسط میں اس میدان میں گرانقدر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سب سے پہلے پروفیسر سید حسن کا نام آتا ہے۔ آپ کا تعلق پٹنہ بہار سے تھا۔ آپ نے ایران سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے بعد فارسی زبان کو فروغ دینے میں اہم کام انجام دیئے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اور

۱۹۸۸ میں آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے مگر دو دانشور اور بھی تھے جو لگاتار اس میدان میں نمایاں کام انجام دے رہے تھے۔ وہ تھے پروفیسر امیر حسن عابدی، اور پروفیسر نذیر احمد۔ اول الذکر عابدی صاحب نے فارسی زبان وادب سے ہندوستان کے شجرِ ادب کو پُر بار کیا۔ آپ کا قلمی نسخوں کی بازیافت اور ان کو روشناس کرانے کام کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک اہم کام جو آپ نے کیا ، وہ تھا ہندوایران کی تاریخ کو مختلف درجوں میں منقسم کرنا۔ اور اپنے شاگردوں کے ذریعے اس کام و پایۂ تکمیل تک پہنچانا۔ کیونکہ یہ ایک واحد طریقہ تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ کو مختلف ادوار کے تحت بچایا جاسکتا تھا۔ آپ نے ہر دور پر یک پی، ایچ، ڈی کا مقالہ لکھوایا جو آج تک فارسی شعبہ میں بدستور جاری ہے۔ اور شعبہ آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تیسری شخصیت جس نے پوری اردو فارسی دنیا کو اپنا گرویدہ بنایا اور صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر ایران، افغانستان، تاجکستان، پاکستان اور یوروپ میں بھی آپ کے قدردانوں کی کمی نہیں۔ آپ کی تصانیف، آپ کے مقالات، آپ کی تقاریر تمام اردو فارسی کے استادوں اور طلباء کے لیے تحقیق وتدوین کے میدان میں اہم منبع اور رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کوئی بھی اسکالر تصحیح وترتیب متن میں آپ کے مقالات اور کتابوں سے استفادہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پھر چاہے متن منظوم ہو یا منثور۔

آج کے دوروزہ سیمنار بعنوان ''۱۹۴۷ء کے بعد فارسی زبان وادب اور پروفیسر نذیر احمد'' آپ کی اہم شخصیت پر منعقد ہوا ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک اہم موضوع ہے۔ اور ناچیز خود کو اس اہل نہیں سمجھتی کہ آپ پر قلم اٹھا سکے یا کچھ لکھ سکے۔ غرض اس کم علم نے ایک موضوع خود کے لیے منتخب کیا جو کچھ سہل بھی تھا۔ آپ پر بے شمار مقالے اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ اور آگے بھی یہ سلسلہ قائم رہنے والا ہے۔ وہ کتابیں جو آپ کے کارناموں اور حیات پر مشتمل ہیں۔ کئی ہیں۔ مثلاً ''پروفیسر نذیر احمد درنظر دانشمندان'' مرتبہ آپ کی دختر برخوردار پروفیسر ماریہ بلقیس صاحبہ، یہ کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ جس میں تقریباً مختلف موضوعات پر ۲۶ مقالات اردو اور فارسی میں شاملِ کتاب ہیں۔

فہرست مضامین

حرفِ آغاز۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی

۱۔ سہ روزہ قومی سیمنار، ایک نظر میں

۲۔ خطبۂ استقبالیہ۔ پروفیسر ماریہ بلقیس

۳۔ کلیدی خطبہ۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی

۴۔ نذیر صاحب۔ پروفیسر آل احمد سرور

۵۔ پروفیسر احمد: چند تالیفات کا ایک مختصر جائزہ۔ پروفیسر سید انوار احمد

۶۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب: ایک تعارف۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی

۷۔ تحقیق وتدوین سے متعلق پروفیسر نذیر احمد کا اسلوب فکر وطریقۂ کار۔ پروفیسر ظہیر الدین ملک

۸۔ پروفیسر نذیر احمد اور ان کے عقیدت مند۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

۹۔ پروفیسر نذیر احمد، ممتاز ماہر غالبیات۔ اکٹر خلیق انجم

۱۰۔ مطالعات غالب اور پروفیسر نذیر احمد کی نکتہ رسی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی

۱۱۔ پروفیسر نذیر احمد کے علمی کارناموں اور ''فارسی قصیدہ نگاری''۔ پروفیسر شعیب اعظمی کا ایک مختصر جائزہ

۱۲۔ فارسی کی رمز شناس بے نظیر: پروفیسر نذیر احمد۔ پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی

۱۳۔ گجرات اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی علمی وادبی خدمات۔ پروفیسر نثار احمد انصاری

۱۴۔ فرہنگ قواس مرتبہ پروفیسر نذیر احمد ترتیب وتصحیح کا ایک اعلیٰ نمونہ۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی

۱۵۔ پروفیسر نذیر احمد، محقق نامور ہند، بحوالۂ تحقیق متن۔ پروفیسر آصفہ زمانی

۱۶۔ عظیم آباد کے علمی وتحقیقی مراکز اور پروفیسر نذیر احمد۔ پروفیسر محمد شرف عالم

۱۷۔ فن فرہنگ نویسی ورشتہ لغت اور پروفیسر نذیر احمد۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

۱۸۔ اردو میں تحقیق کی روایت اور ڈاکٹر نذیر احمد۔ ڈاکٹر محمد نورالاسلام

۱۹۔ پروفیسر نذیر احمد کی غالب شناسی کے چند گوشے۔ اکٹر عراق رضا زیدی

۲۰۔ نظر بر شخص دانش۔ ڈاکٹر معتصم عباسی

۲۱۔ پروفیسر نذیر احمد ایک عظیم محقق ودانشور۔ ڈاکٹر ریحانہ خاتون

۲۲۔ پروفیسر نذیر احمد ''فارسی قصیدہ نگاری'' کے آئینے میں۔ ڈاکٹر علیم اشرف خان

۲۳۔ ......از لطف شامی بینم۔ ڈاکٹر زہرہ عرشی

۲۴۔ پروفیسر نذیر احمد کے چند تحقیقی انکشافات۔ڈاکٹر شوکت نہال انصاری

۲۵۔ پروفیسر نذیر احمد: ترتیب وتدوین متن کے آئینے میں۔ڈاکٹر رعنا خورشید بخش فارسی

۲۶۔ پروفیسر نذیر احمد در جہان نقد و پژوہش۔پروفیسر عبدالقادر جعفری

پروفیسر نذیر احمد صاحب پر ایک اور کتاب ۱۹۹۲ء میں قند پارسی کے نام سے ایران سے شائع ہوئی جس میں آپ کے مقالات کو مجموعہ تھا۔اس کتاب کو مرتب کرنے والے پروفیسر حسن عباس گوپال پوری تھے۔یہ کتاب آپ کے ۱۸ ادبی مقالات پر مشتمل تھی۔جو تین حصوں میں منقسم کی گئی تھی۔مثلاً پہلا حصہ پژوھشھای زبان فارسی دوسرا حصہ پژوھشھای تاریخی تیسرا حصہ نسخہ شناسی وکتاب شناسی۔

اس کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی۔جس میں مقالات کی تعداد کل گیارہ تھی۔

''زندگی نامہ وخدمات علمی وفرھنگی پروفیسر دکتر نذیر احمد'' یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں تہران سے پروفیسر محمد رضا نصیری صاحب کی رہنمائی میں انجمن آثار و مفاخر فرھنگی سے شائع ہوئی۔اس میں بھی آپ پر اور آپ کے مقالے شامل ہیں۔جو اردو زبان سے فارسی میں ترجمے ہوئے۔مختلف اساتذہ نے ان کا ترجمہ فارسی میں کیا مثلاً پروفیسر چندر شیکھر، ڈاکٹر عبدالقادر ہاشمی، یہ کتاب بھی اپنی نوعیت کی ایک اہم کتاب ہے۔مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ پیش گفتار: محمد رضا نصیری

۲۔ روش شناسی فرہنگ نویسی وفقہ اللغۃ پروفیسور نذیر احمد: محمد ضیاء الدین انصاری (رئیس کتابخانہ خدا بخش، پٹنہ) مترجم، ڈاکٹر عبدالقادر ہاشمی

۳۔ شیوۂ تحقیقِ پروفیسور نذیر احمد: ظہیر الدین ملک (سابق استاد شعبۂ تاریخ علی گڑھ) مترجم ڈاکٹر عبدالقادر ہاشمی۔

۴۔ صاحب علوم وفنون بی شمار: خلیق انجم (ڈائریکٹر انجمن ترقی اردو ہند) مترجم، ڈاکٹر چندر شیکھر۔

۵۔ خلف صادق علمای سلف: شعیب اعظمی (صدر شعبۂ زبان و ادبِ فارسی جامعۂ ملیۂ اسلامیہ) مترجم، ڈاکٹر چندر شیکھر۔

۶۔ گسترۂ دانش: پروفسور شریف حسین قاسمی، مترجم ڈاکٹر چندر شیکھر۔

۷۔ جستجو گر راہ ھای گم شدہ: مترجم، قاضی خواجہ محمد یوسف: مترجم، ڈاکٹر چندر شیکھر۔

۸۔ مایۂ مباہات ھندیان: اسلوب احمد انصاری، (صدر شعبۂ زبان و ادبیات انگلیسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) مترجم، ڈاکٹر چندر شیکھر۔

۹۔ یکی از قدیم ترین شروع مخزن الاسرار نضامی، نوشتہ شدہ در ہند: پروفسور نذیر احمد۔

۱۰۔ کارنامہ: ڈاکٹر ریحانہ خاتون، (سابق استاد، شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی)

ایک کتاب جو نذیر شناسی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے وہ اہم کتاب ہے۔ ''کارنامۂ نذیر'' کیونکہ جس قدر معلومات و اطلاعات اس کتاب میں آپ سے متعلق ملتی ہیں۔ شاید ہی کسی کتاب میں موجود ہوں۔ کیونکہ اس کی مرتب کرنے والی کوئی نہیں اُن کی پیاری بیٹی پروفیسر ریحانہ خاتون ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں نذیر صاحب کی ۸۰ ویں سال گرہ کے موقع پر ایک بیٹی کا تحفہ تھا یہ کتاب۔ پروفیسر ریحانہ میڈم جو خود بھی ایک محقق (وہ بھی مشکل پسند) ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ آپ نے واقعی ایک محقق اور اس سے بڑھ کر ایک بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ نذیر صاحب سے متعلق ذاتی اطلاعات (معتبر) کے علاوہ آپ نے ایک مکمل مواد آپ کی کتابوں کا، آپ کے مکمل مقالات کا، آپ کے جائزات و اسناد کا پیش کر دیا ہے۔ جو اساتذہ اور ہر طالب علم کے لیے ''نذیر شناسی'' کے لیے سود مند ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر ریحانہ خاتون نے دوسرے استادوں، دوستوں اور شاگردوں کے آرا (تفکر و خیالات) بھی اس کتاب میں شامل کر دیئے ہیں۔ جو بہت جالب اور پُر لطف ہیں۔

''شیخ الطایفہ: پروفیسر نذیر احمد'' یہ کتاب بھی پروفیسر ریحانہ کی مرتب کردہ ہے۔ جس میں دیگر اشخاص کے علاوہ خود نذیر صاحب کے اردو اور انگریزی کے مقالے تحریر ہیں۔ مختلف ایوارڈز و تصاویر بھی کتاب کو مزین کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اس کتاب میں تقریباً ۲۳ مقالے شامل ہیں۔ جس میں بارہ مقالے خود نذیر صاحب کے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

فہرست

Gallery of art in washington D.C.

۲۱۔ Iniugurationof AIPTA پروفیسر نذیر احمد

۲۲۔ Aims & objects of II AIPTA پروفیسر نذیر احمد

۲۳۔ Lecture پروفیسر نذیر احمد

۲۴۔ فہرست کتاب و مقالات

۲۵۔ رپورٹ ڈاکٹر حسن عباس

۲۶۔ شعر، جائزہ و تصاویر

''قند پارسی'' سہ ماہی جرنل مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران نئی دہلی سے شائع ہونے والا ایک گرانقدر اور اہم فصل نامہ جو فارسی زبان و ادب و تہذیب پر مشتمل ہے۔ ۲۰۱۲ء میں ایران کلچر ہاؤس نے Special Number on Prof. NazirAhmad شائع کیا۔ جس میں کل ۳۱ مقالے شامل تھے۔ جس میں استاد نذیر احمد صاحب کے خود کے ۱۲ مقالے صادق جونپوری کے ترجمے کے ساتھ اس کتاب میں موجود تھے۔ مقالوں کے علاوہ پروفیسر عراق رضا زیدی اور ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کے قطعۂ تاریخ وفات استاد نذیر احمد بھی شامل تھے۔ مقالات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سخن سردبیر علی فولادی

۲۔ زندہ یاد استاد نذیر احمد شریف حسین قاسمی

۳۔ نابغۂ روزگار ناقد و مصحح ریحانہ خاتون، ترجمہ خاں محمد صادق جونپوری

۴۔ پروفسور نذیر احمد و کارنامۂ ادبی وی عتیق الرحمن

۵۔ محمد قاسم سروری نگارندۂ مجمع الفرس شادروان نذیر احمد

۶۔ دانشمندانی کہ تفسیر طبری را ترجمہ و تلخیص کردہ اند شادروان نذیر احمد

۷۔ کہن ترین مجموعۂ طبی در شعر دری موسوم بہ دانشنامہ حکیم میسری شادروان نذیر احمد

۸۔ نگاھی بہ دیوان عمید تصحیح استاد نذیر احمد ماریہ بلقیس

۹۔ فرھنگ زفان گویان و جہان پویان تصحیح استاد نذیر احمد سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی

۱۰۔ تصحیح دیوان سراجی عراق رضا زیدی، ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۱۱۔ کشف، تصحیح وتحشیہ مکاتیب سنایی علیم اشرف خان

۱۲۔ ویژگی ھای تصحیح دیوان سراجی راجندر کمار

۱۳۔ شیوۂ تحقیق پروفسور نذیر احمد در نقد قاطع برہان علاء الدین شاہ

۱۴۔ فرہنگ فواس تصحیح استاد نذیر احمد محمود فیاض ہاشمی

۱۵۔ روابط فرہنگی دکتر نذیر احمد با کتابخانہ خدا بخش رضوان اللہ آروی

۱۶۔ نظری کوتاہ بر نقد قاطع برہان واصف احمد

۱۷۔ استاد نذیر احمد: حافظ شناس مہتاب جہان

۱۸۔ معرفی نسخۂ خطی کتاب نُورَس تصحیح استاد نذیر احمد شہناز پروین

۱۹۔ مجموعۂ لطائف وسفینۂ ظرائف تصحیح استاد نذیر احمد فوزیہ وحید

۲۰۔ پروفسور نذیر احمد وتصحیح بسائین الانس اکبر شاہ

۲۱۔ میرزا غازی بیگ فرحان ودیوان او شادروان نذیر احمد ترجمہ عمر کمال الدین کاکوروی

۲۲۔ ؟؟؟خطی نادر ومعرفی آن شادروان نذیر احمد، ترجمہ محمد ارشد القادری

۲۳۔ ؟؟از مسائل مربوط بہ مقدمہ دیوان حافظ شادروان نذیر احمد، ترجمہ شمیم الحق صدیقی

۲۴۔ چہرۂ ماندگار وقزوینی ہند ریحانہ خاتون، ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۲۵۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی پیشتاز فرہنگ مشترک۔ شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۲۶۔ مولانا زادہ بدیعی سمرقندی شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۲۷۔ روابط سیاسی شاہ عباس اول وسلاطین قطب شاہی شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۲۸۔ کلام جدید سلاطین وامرای گورکانی شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۲۹۔ کتابخانہ حبیب گنج شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۳۰۔ نسخۂ نادر تاریخ سلاطین گجرات شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۳۱۔ تاریخ علم وفرہنگ دکن شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۳۲۔ فرہنگ جعفری شادروان نذیر احمد ترجمہ خان محمد صادق جونپوری

۳۳۔ قطعۂ تاریخ وفات استاد نذیر احمد عراق رضا زیدی

یہ تھے ان کتابوں کے چند حوالے یا ذکر جس میں نذیر صاحب پر پیش بہا معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ یہ مقالے، یا مختلف کتابیں، یا اس طرح کی ادبی مجلسیں، سیمنار، کنفرانسیں، سب ایک ''ادنیٰ سا'' ذریعہ ہیں آپ جیسی ''عظیم المرتبت شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا۔ کیونکہ جس طرح اس بلند پایہ محقق پر کام ہونا چاہیے تھا، آج تک نہیں ہو پایا ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب نے قند پارسی میں اپنے ایک ''زندہ یادِ استاد نذیر احمد'' مقالے میں اس بابت درست فرمایا ہے۔ کہتے ہیں: ''گذارش مفصل وشایستہ ای در بارہ سھم این استاد در پیش برد تحقیقات زبان فارسی چنانکہ باید تا کنون نوشتہ نشدہ است۔ حیف است کہ یک محقق بہ معنی حقیقی کہ گرد فراموش وگمنامی را از چہرہ تعداد زیادی از شعرا وادبا وآثار آنہا زدود، اکنون خود منتظر فرھیختہ ای مانند خود باشد کہ خدماتش را بہ طور شایستہ معرفی کند[1]۔''

مگر ہمیں ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ جس قدر بھی کام آپ پر ہوا ہے وہ خاطر خواہ اور قابل ستائش ہے۔ پس امید رکھنی چاہیے کہ اور بہتر کام کیا جائے کیونکہ کئی عظیم ہستیاں ماضی میں ایسی بھی ہیں جن پر قلم تک نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اور وہ شخصیتیں ماضی کے گھرے اندھیروں میں گم ہوگئی ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب اپنی علمی وادبی تخلیقات کے علاوہ دو جیتی جاگتی ہستیاں اردو فارسی دنیا کے لیے تحفتہً اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ ہیں آپ کی دو بیٹیاں جنھوں نے فارسی کے خدوخال کو سنوارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ایک فارسی شعبہ دہلی یونیورسٹی کی سابق صدر و استاد پروفیسر ریحانہ خاتون صاحبہ، دوسری فارسی شعبۂ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سابق صدر و استاد پروفیسر ماریہ بلقیس صاحبہ۔ دونوں اپنے عہدوں سے سبک دوش ہوچکی ہیں مگر آج بھی فارسی زبان وادب کے میدان میں قابل رشک وستائش کام انجام دے رہی ہیں۔ پروفیسر ریحانہ خاتون تو پدم شری اور دہلی یونیورسٹی کی ایمرٹس پروفیسر ہیں۔

☆☆

۱۔ قند پارسی، ص ۱۰، مقالہ بعنوان زندہ یاد استاد نذیر احمد'' ۲۰۱۲

نکہت فاطمہ
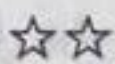
پروفیسر نذیر احمد اور ابراہیم عادل شاہ کے دور کا ادب

پروفیسر نذیر احمد صاحب کا شمار فارسی زبان و ادب کے مایہ ناز محققین اور شہرہ آفاق دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی پیدائش ۳ جنوری ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش، ضلع گونڈہ کے گاؤں کولہی غریب میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بنگواں کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں ہوئی۔ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں منشی کا امتحان اور ۱۹۳۶ء میں کرسچین کالج لکھنؤ سے انٹر کا امتحان پاس کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ آنرز (فارسی) اور ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے ساتھ ہی تحقیق کا شوق پیدا ہوا اور اسی شوق کی بنا پر فارسی کے مشہور شاعر اور نثر نگار ظہوری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ "Zuhuri: Life and works" کے عنوان سے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی زیر نگرانی انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس دوران ابراہیم عادل شاہ ثانی کے غیر معمولی کمال نے اس حد تک متاثر کیا کہ اس کے عہد کے ادب پر کام شروع کیا اور تقریباً چار پانچ سال کی کاوشوں کے بعد تحقیقی مقالہ بعنوان "Persian Poetry of Adilshahi's regime" مکمل کیا جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے آپ کو ڈی۔ لٹ۔ کی ڈگری عطا کی۔ اب تحقیق میں شغف اور زیادہ ہوا جس بنا پر اردو ادب کی طرف بھی

طبیعت مائل ہوئی۔ پھر ابراہیم عادل شاہ کی کمیاب کتاب نورس کی ترتیب و تدوین میں مشغول ہو گئے اور اس کتاب پر اپنی تحقیق مکمل کی۔ ڈی۔لٹ۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۵۵ء۔۱۹۵۶ء میں فارسی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایران تشریف لے گئے اور تہران یونیورسٹی میں داخلہ لے کر یہاں سے چار مضامین یعنی پہلوی، فارسی قدیم، فارسی جدید اور تاریخ میں ڈپلوما حاصل کیا۔ ایران میں اپنے قیام کے دوران وہاں کے کئی کتاب خانوں کے قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا اور ان پر مضامین لکھے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں تاریخ ادب اردو کے ڈائریکٹر اور ۱۹۵۸ء میں شعبہ فارسی علی گڑھ یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر تقرر ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے پر، ۱۹۶۹ء میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۷ء تک شعبہ فارسی میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۸ء میں فارسی تحقیق و تنقید پر صدر جمہوریہ ہند نے توصیفی سند پیش کی۔ ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کی علمی اور ادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے استاد ممتاز (Professor Emeritus) مقرر کیا۔

آپ نے ہند اور بیرونی ہند کی بہت سی یونیورسٹیوں میں علمی مجالس و مذاکرات میں حصہ لیا۔ بیرونی ہند کی یونیورسٹیوں مثلاً ایران کے شہروں جیسے تہران، مشہد، شیراز، کرمان، تبریز، افغانستان میں کابل، .U.S.A میں شکاگو، واشنگٹن، .U.S.S.R میں سمرقند، بخارا، دوشنبہ، پاکستان میں کراچی، لاہور، سندھ کے علاوہ تاجکستان اور کویت جیسے ممالک میں علمی و ادبی مجالس میں شرکت کی اور ہندوستان کی سبھی یونیورسٹیوں میں لکچر دیے، جہاں فارسی اور اردو کے شعبے موجود ہیں۔

محمد رضا نصیری صاحب آپ کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''استاد در هر محفل حرفی تازه برای گفتن دارد. گویی برای تحقیق و مطالعه و بحث و مباحثه آفریده شده است. به آرامی سخن می گوید. محققی است پرکار. پژوهشگری است نستوه و ادیبی است فرزانه. او را ''دانای هند'' خطاب کرده اند و بی شک نام استاد همواره در عرصۂ زبان و ادب فارسی

جاودانه خواهد ماند.''(۱)

نذیر صاحب سے متعلق پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''نذیر صاحب نے فارسی زبان و ادب کے گونا گون اہم موضوعات پر علمی، تحقیقی اور تاریخی کام انجام دیے ہیں۔ آپ کی علمی کاوشوں کا مناسب طور پر جائزہ وہی صاحب نظر عالم لگا سکتا ہے، جو ایران و ہند کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور ادبی تاریخ سے کما حقہ واقف ہو۔''
> (۲)

فارسی زبان و ادب میں مختلف موضوعات پر نذیر صاحب نے سینکڑوں مقالات لکھے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے موقر رسالوں میں شائع ہوئے۔ یہ مقالات زبان و ادب کے گونا گون موضوعات پر ہیں جیسے زبان شناسی، قواعد، مخطوطہ شناسی، مصوری، خطاطی، معماری، تاریخ، تنقید وغیرہ۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے دکنیات کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنی تحقیقات کے ذریعہ روشناس کرایا۔ خواہ وہ قطب شاہی دور ہو یا عادل شاہی دور یا مجموعی طور پر دکنی ادب ہو۔ چونکہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور ڈی۔ لٹ۔ کے تحقیقی مقالات کے موضوعات عادل شاہی دور سے متعلق تھے، اس لیے آپ کی دلچسپی عادل شاہی دور خصوصاً ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت میں زیادہ رہی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸۔۱۰۳۷ھ) عادل شاہی دور کا چھٹا اور جلیل القدر بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں بیجاپور علوم و فنون اور ادب کا ایک بڑا مرکز اور گہوارہ بن گیا تھا۔ چنانچہ علمی و ادبی ترقی کے لحاظ سے اس بادشاہ کا شمار ہندوستان کے ممتاز بادشاہوں میں کیا جاتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کو تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ محمد قاسم فرشتہ کی 'گلشن ابراہیمی' معروف بہ 'تاریخ فرشتہ' اور رفیع الدین شیرازی کی 'تذکرۃ الملوک' اسی بادشاہ کے دور کی زندہ جاوید تواریخ ہیں۔ ظہوری، ملک قمی، حیدر ذہنی، باقر کاشی، سنجر کاشی جیسے شعرا اسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ابراہیم عادل شاہ خوش نویسی سے بھی شغف رکھتا تھا اور خط شکستہ، نسخ، نستعلیق بہت عمدہ لکھتا تھا۔ اس کے دور حکومت میں کئی خوشنویس اور مصور موجود تھے۔

اس مختصر مضمون میں پروفیسر نذیر احمد صاحب کے ابراہیم عادل شاہ کے دور سے متعلق کچھ کتابوں اور تحقیقی مقالات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس بادشاہ کے دور پر لکھے گئے پروفیسر صاحب کے ان مقالات کی چار حصّوں میں درجہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

۱۔ادبیات ۲۔موسیقی ۳۔خطاطی ۴۔عادل شاہی دور کے صفوی بادشاہوں سے روابط

۱۔ادبیات:

(i)"Zuhuri: His life and works" یہ کتاب انگریزی میں الٰہ آباد سے شائع ہوئی۔ یہ آپ کے پی۔ایچ۔ڈی۔ کے مقالے کی پہلی جلد ہے جس میں ظہوری کے حالات زندگی اور اس کے کلام کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظہوری کی شاعری اور نثر نگاری کی ہندوستان میں بڑی شہرت رہی ہے۔ وہ بحیثیت نثر نگار زیادہ مقبول رہا ہے۔ چنانچہ اس کے تین نثری شہہ پارے 'سہ نثر ظہوری' کے نام سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اعلیٰ سطح کے طلبا کے نصاب میں شامل ہیں۔

(ii) 'غالب اور ظہوری' کے عنوان سے نذیر صاحب کا ایک مقالہ مجلّہ 'اردو ادب' جولائی تا دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ یہ مقالہ آپ کی کتاب 'تحقیقی مطالعے' میں بھی شامل ہے۔ یہ کتاب دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

اس مقالے میں پروفیسر صاحب نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ متاخرین شعرائے فارسی میں مرزا غالب نے مجموعی طور پر ظہوری کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا ہے اور اس کی مثالیں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً غالب 'مثنوی باد مخالف' میں لکھتے ہیں:

خاصه روح روان معنی را	آن ظهوری جهان معنی را
طرز اندیشه آفریدهٔ اوست	در تن لفظ جان دمیدهٔ اوست

مختلف غزلیات میں بھی مرزا نے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ قابل غور ہیں۔ ابیات ذیل میں ظہوری سے فیض پذیری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

نظم و نثر مولانا ظهوریؔ زنده ام غالب
رگ جان کرده ام شیرازه اوراق کتابش

دوسری جگہ کہتے ہیں:

غالبؔ از اوراق ما نقش ظہوریؔ دمیدسرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دھیم

غالب نے فارسی میں متعدد غزلیں ظہوری کے مقابلہ میں لکھی ہیں جن کی نشاندہی بھی پروفیسر صاحب نے اس مقالہ میں کی ہے۔ ساتھ ہی دونوں شعرا کی غزلیات کا موازنہ بھی کیا ہے۔ غالب نے پوری کی پوری غزل ظہوری کے تتبع میں کہی ہے جن کی مثالیں استاد نے اس مقالے میں فراہم کی ہیں۔ علاوہ ازاین آپ فرماتے ہیں کہ نہ صرف فارسی بلکہ غالب کا اردو دیوان بھی ظہوری کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً:

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائی غالبؔ　　میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

اردو میں جستہ جستہ اشعار میں تقریباً ایسے خیالات ادا ہوئے ہیں جو بلاشبہ ظہوری سے مستفاد ہیں۔ بہ طور مثال:

ظہوری: معنی اتحاد را دیدم　　در تماشا نگاہ حائل است

غالب: واکردیۓ ہیں شوق نے بند نقاب حسن　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اسی طرح کی دیگر اردو و فارسی کی مثالوں سے استاد نے غالب پر ظہوری کی اثر پذیری ثابت کی ہے۔

(iii) گلزار ابراہیم وخوان خلیل

یہ مقالہ 'معارف' اعظم گڑھ میں مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کتاب 'تحقیقی مطالعے' ص ۸۹۔ ۱۱۷ میں بھی شامل ہے۔

اس مقالے میں استاد محترم نے سہ نثر ظہوری کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ سہ نثر ظہوری کو اپنے مخصوص ومنفرد طرز کی وجہ سے جو شہرت حاصل ہوئی وہ فارسی کی چند کتابوں کے حصّے میں آتی ہے لیکن غیر معمولی شہرت کے باوجود اس کی تاریخی حیثیت بڑی حد تک مشکوک و مجہول ہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یہ تین چھوٹے چھوٹے نثر کے رسالے ہیں جن کا دیباچے وغیرہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سہ نثر 'کتاب نورس' مولفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے تین دیباچوں کے مجموعے میں پہلی نثر کتاب نورس کا دیباچہ ہے۔ دوسری گلزار ابراہیم کا اور تیسری خوان خلیل کا۔ کتاب نورس کا مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے اور گلزار ابراہیم اور خوان خلیل ظہوری اور

ملک کی دو مشترکہ تصنیف ہیں جن کی حیثیت دو بیاضوں کی ہے۔ گلزار ابراہیم نو ہزار ابیات پر مشتمل ایک بیاض تھی جس کو ملک اور ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب صرف ان دونوں شاعروں کی نظموں سے مرتب ہوئی اور اس میں تقریباً تمام اصناف سخن شامل تھے۔ اس کتاب کی تکمیل پر ملک اور ظہوری کو گران قدر صلے بھی ملے تھے۔

خوان خلیل بھی ملک اور ظہوری کی گلزار ابراہیم کی طرح ایک بیاض تھی۔ آزاد بلگرامی خود ملک اور ظہوری کے بیانات کی روشنی میں پروفیسر نذیر صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خوان خلیل گلزار ابراہیم کا تکملہ ہے۔ یہ گلزار ابراہیم کے بعد لکھی گئی۔ گلزار ابراہیم کی طرح یہ بھی دونوں کی مشترکہ تصنیف ہے اور اس کا سنہ تکمیل ۱۰۱۴ھ ثابت ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظہوری کی یہ تینوں نثریں جو خطبہ، مقدمہ، دیباچہ، رسالہ اور نثر وغیرہ ناموں سے یاد کی گئی ہیں، مختلف کتابوں کے دیباچوں کا مجموعہ ہیں جو کافی وقفہ کے بعد لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ یہ دیباچے اصل کتاب سے الگ ہو گئے اور اتفاق ایسا ہوا کہ وہ اصل کتابیں تو گمنامی میں پڑ کر چشم عالم سے روپوش ہو گئیں لیکن یہ دیباچے اپنے مخصوص طرز کی بنا پر زندہ جاوید تو ہو گئے اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ان کے جوہر کھلتے گئے۔ چنانچہ وہ ایک ساتھ مدون و منطبع ہوئے تو ان کا مجموعی نام 'سہ نثر' قرار پایا۔

۲۔ موسیقی:

ابراہیم عادل شاہ شعراء، ادبا اور مؤرخین کا سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی شاعری سے شغف رکھتا تھا اور موزوں طبیعت پائی تھی۔ فارسی اور دکنی زبانوں میں مشق سخن کرتا تھا۔ موسیقی سے رغبت کا یہ عالم تھا کہ نو آباد شہر 'نورس پور' کا ایک محلّہ موسیقی دانوں ہی کا تھا جن کی تعداد کئی ہزار تھی۔ دکنی زبان میں اس کی ذاتی تصنیف اور کتاب نورس ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم بادشاہ کو نہ صرف دکنی بلکہ سنسکرت، برج بھاشا اور ہندو دیومالا پر اس کو عبور حاصل تھا۔ بادشاہ کو لفظ 'نورس' سے خاص انسیت تھی۔ کئی چیزیں اس کے دور میں 'نورس' کے نام سے موسوم ہوئیں۔

۱۔ کتاب نورس: بادشاہ کی تصنیف

۲۔ نورس: شاعر

۳۔نورسی: ایک اور شاعر ۴۔نورس: شراب

۵۔نورس: نغمہ ۵۔نورس: جھنڈا

۷۔نورس: شاہی نشان

۸۔نورس: دفتر

۹۔نورس: عید ۱۰۔نورس: محل

۱۱۔بہشت نورس: ایک دوسری عمارت ۱۲۔نورس: سکہ

۱۳۔نورس نامہ: تاریخ فرشتہ کا دوسرا نام

۱۴۔نورس پیکر: ہاتھی

۱۵۔ہن نورس: ایک سکہ ۱۵۔نورس پور: شہر

بادشاہ کی تصنیف 'کتاب نورس' علم موسیقی پر ایک مختصر کتاب دکنی نظم میں ہے۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کے ۵۹ گیتوں اور کچھ دھروں کا مجموعہ ہے جس کے متعدد ہمعصر نسخے پروفیسر نذیر احمد نے جمع کیے اوران کے باہمی مقابلے سے ایک نسخہ اردو میں مع ترجمے اور حواشی کے ۱۹۵۴ء میں دانش محل، امین الدّولہ پارک، لکھنؤ سے شائع کی۔

پھر یہ کتاب انگریزی میں مفصل مقدمے اور گیتوں کے انگریزی ترجمے اور حواشی کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں بھارتیہ کلا کیندر کی طرف سے شائع ہوئی۔

لکھنؤ سے شائع شدہ کتاب نورس کے تعارف میں پروفیسر نذیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

> "ظہوری اور ابراہیم عادل شاہ پر دس سال کام کرنے کی بنا پر کتاب نورس سے قدرتاً مجھے بے حد لگاؤ تھا۔ مگر موضوع کی دشواری اس طرف متوجہ ہونے میں سدّ راہ تھی ۔۔۔ میں اس کتاب کے مختلف نسخوں کی تلاش میں مصروف ہوا۔(۳)

پروفیسر نذیر صاحب کو کتاب نورس کے تقریباً دس نسخوں کا پتہ چلا جن میں سے ۹ نسخوں کی نقل حاصل کی۔ یہ نسخے "Central record office"، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، پرنس آف ویلز ممبئی، حیدرآباد میوزیم حیدرآباد، کتاب خانہ خدا بخش بانکی پور پٹنہ، کتابخانہ رام پور، نسخہ مملوکہ پروفیسر حسین علی خان حیدرآباد وغیرہ۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

''یہ تمام نسخے ناقص اور بے ترتیب تھے۔ موضوع اور زبان کی دشواری الفاظ کا صحت کے ساتھ پڑھا نہ جانا، صفحوں پر ہندسوں یا دوسرے نشانات کی عدم موجودگی اور ہر نسخے کی الگ ترتیب کا کام جس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جن کو اس طرح کے کام سے سابقہ پڑا ہو۔'' (۴)

پروفیسر محمد حسن صاحب نذیر صاحب کے اس اہم شاہکار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نذیر احمد صاحب فارسی کے ان گنت نرالے تحقیقی کام کرتے کرتے کتاب نورس سے ٹکرا گئے۔ 'اللہ الصمد' اوّل تو قدیم دکنی کی کتاب، دوسرے علم موسیقی پر، تیسرے ہندو دیو مالا اور سنسکرت کے حوالوں سے بھری ہوئی، چوتھے زبان ایسی نامانوس کہ ایک ایک لفظ پڑھنا اور سمجھنا گویا 'لانا ہے جوئے شیر کا'۔ (۵)

کتاب نورس سے متعلق نذیر صاحب کے کئی مضامین ہیں جو مختلف مجلات میں شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً:

(i) کتاب نورس، اردو ادب، اپریل تا جون ۱۹۵۲ء

(ii) کتاب نورس کے کچھ مخطوطات، معارف، جولائی ۱۹۵۳ء

(iii) کچھ کتاب نورس کے متعلق، معارف، مارچ۔ اپریل ۱۹۵۶ء

(iv) Kitab-i Nauras, Islamic Culture, Hyderabad, July 1954

جیسا کہ عرض کیا گیا کتاب نورس علم موسیقی سے متعلق ایک مختصر کتاب دکنی نظم میں ہے۔ اس میں کچھ راگ راگنیوں کی تصریح اس قدر ہے کہ ایک راگ یا راگنی کو عنوان قرار دے کر اس کے ماتحت بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کے نظم کیے ہوئے گیت درج کر دیے گئے ہیں۔ ہر گیت موضوع کے اعتبار سے مختلف ہے۔ کتاب نورس کے ۹ نسخوں میں ۱۷ راگوں کے ذیل ۵۹ گیت اور ۱۷ دوہرے ملے ہیں۔ ان راگوں کے نام یہ ہیں:

راگ بھوپالی، رامکری، بھیرو، مجیز، مارو، اساوری، دیسی، پوریا، براری، ٹوڈی، ملار، گوری، کلیان، دھناسری، کنڑایا کرناٹکی، کیدارا، نوروز۔

بیشتر گیت ہندو دیومالاؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔ شیو، پاروتی، سرسوتی، گنیش، اندر وغیرہ دیوی دیوتاؤں کا ذکر بار ہا آتا ہے۔ ایسے گیت بھی ہیں جن میں حضرت شاہ گیسودراز سے عقیدت مندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ کچھ گیتوں میں عاشقانہ مضامین باندھے گئے ہیں۔

کتاب نورس میں اصل متن کے بعد دوہروں اور گیتوں کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ استاد محترم فرماتے ہیں:

> ''کتاب نورس کی زبان جتنی مشکل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لحاظ سے اس کے تمام گیتوں اور دوہروں کا ترجمہ شامل کرنا بے حد ضروری تھا۔ لیکن کئی سال کی تسلسل کوشش کے بعد بھی چند گیت ایسے ہیں جن کا ترجمہ بھی ہوا ہے اسے حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ابھی اس پر مزید اضافے کی گنجائش ہے۔''(۶)

چونکہ کتاب نورس میں ہندو دیوتاؤں کے قصے اور اسلامی تلمیحات بیان ہوئی ہیں اس لیے ترجمے کے بعد تلمیحات کے عنوان سے ایک باب دیا گیا ہے۔ جس میں حرف تہجی کے اعتبار سے تلمیحات درج ہیں۔ آخر میں بہ اعتبار حرف تہجی فرہنگ دی گئی ہے۔

۳۔ خطاطی:

ابراہیم عادل شاہ ثانی خطاطی میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے دو سورے، سورۃ مائدۃ اور سورۃ انعام محفوظ ہیں۔ وہ خط شکستہ، نسخ اور نستعلیق بہت اچھا لکھتا تھا۔ اس کے دور حکومت میں کئی خطاط موجود تھے۔ اہم خطاطوں میں شاہ خلیل اللہ جس پر پروفیسر نذیر احمد صاحب کا تفصیلی مضمون بہ عنوان 'ابراہیم عادل شاہ کا درباری خطاط: شاہ خلیل اللہ' نذر ذاکر میں نئی دہلی سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ یہی مقالہ انگریزی میں ۱۹۷۰ء میں Islamic Culutre, Hyderabad سے بہ عنوان 'Shah Khalilullah, the royal Calligraphist of the Adil Shah Court." شائع ہوا۔

اس مقالے میں استاد نے شاہ خلیل اللہ سے متعلق معلومات کے تین ماخذ کا ذکر کیا ہے۔ پہلا

'فتوحات عادل شاہیہ' تالیف فزونی استرابادی۔ یہ تاریخ ۱۰۵۱ھ میں لکھی گئی۔ چونکہ مؤلف عادل شاہ کے بیٹے محمد عادل شاہ کا درباری مؤرخ تھا اور ایک مدت تک بیجاپور میں مقیم رہا، اس وجہ سے شاہ خلیل اللہ سے متعلق اطلاعات کے ذرائع مستند رہے ہونگے۔ دوسرا ماٗخذ 'عالم آرای عباسی' ہے۔ اس کا مؤلف اسکندر منشی شاہ عباس کا درباری مؤرخ تھا۔ تیسرا ماٗخذ 'سہ نثر ظہوری' ہے۔ جس کے تیسرے حصے میں ظہوری نے ارکان دولت عادل شاہی کے ذیل میں اس خطاط کی بے حد تعریف کی ہے۔ ظہوری اور خلیل اللہ ایک ہی دربار سے وابستہ تھے۔ اس وجہ سے سہ نثر ظہوری کے بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ نذیر صاحب نے 'فتوحات عادل شاہیہ' کے حوالے سے خلیل اللہ کے احوال زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ پہلے شاہ عباس اوّل (۹۹۶۔۱۰۳۸ھ) کے دربار سے منسلک تھا اور بظاہر خطاطی میں اسے بادشاہ کی استادگی کا شرف بھی حاصل تھا۔ جب شاہ عباس خراسان کی مہم سے عراق واپس ہو رہا تھا، اس وقت خلیل اللہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ شاہ عباس کی خراسان کی مہم ۹۹۷۔۱۰۱۲ھ کے درمیان رہی۔ فزونی استرابادی کے مختلف بیانات کی روشنی میں نذیر صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خلیل اللہ غالباً ۱۰۰۱۔۱۰۰۹ھ کے درمیان بیجاپور پہنچا ہوگا۔ عادل شاہی دربار میں خلیل اللہ کی بڑی پزیرائی ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ سلطان ابراہیم کا معتمد علیہ ہوگیا۔ چنانچہ بادشاہ نے اسے سفیر بنا کر شاہ عباس کے دربار میں بھیجا۔ وہ خط نستعلیق میں ماہر تھا۔ اسکندر منشی نے اسے 'نادرۂ روزگار' قرار دیا ہے۔ فزونی کے نزدیک متقدم اور متاخر خطاطوں میں اس کے مرتبے کو کوئی نہیں پہنچا۔ ظہوری نے اس کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے یہ باتیں خصوصیت سے معلوم ہوئیں۔ اوّلاً وہ اراکین سلطنت میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ ظہوری نے سات ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جن میں سے خلیل اللہ کا ذکر تیسرے نمبر پر ہوا ہے۔ دوسرے وہ فن نستعلیق میں غیر معمولی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے کتاب نورس کا ایک نسخہ تیار کر کے ۱۰۲۷ھ میں ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان اس تحفے سے اتنا خوش اور خطاط کے کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے 'بادشاہ قلم' کا خطاب عنایت کیا۔

اس مقالے میں نذیر صاحب نے عادل شاہی دور کے ایک اور خطاط کا ذکر کیا ہے جس کا نام سلیمان ناجی تھا۔ اس نے بھی کتاب نورس کا ایک مصوّر نسخہ تیار کیا تھا جو اب تک دریافت شدہ نسخوں میں سب سے زیادہ مکمل اور عمدہ حالت میں ہے۔ اس کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ

یہ شہر نورس پور میں تیار ہوا جسے ابراہیم عادل شاہ نے بنوایا تھا۔ مگر خود اسی بادشاہ کی حیات میں ۱۰۳۳ھ میں نظام شاہی سپہ سالار ملک عنبر کے ہاتھوں برباد ہوا۔

۴۔ عادل شاہی دور کے صفوی بادشاہوں سے روابط:

دکن کی مختلف ریاستوں کے ایران کے صفوی بادشاہوں سے روابط رہے۔ اس موضوع پر پروفیسر صاحب نے یہ مقالات لکھے:

Ibrahim Adilshah's diplomatic relations with the Safavids, (i)
Islamic Culture, Hyderabad, 1969

(ii) یہ مقالہ ''ھئیات ھای سیاسی عادل شاہی بہ دربار شاہ عباس صفوی'' کے عنوان سے فارسی میں مجلہ بررسی ھای تاریخی تہران، شمارہ ۱، سال چہارم میں شائع ہوا۔

(iii) اس کے علاوہ ایک مقالہ "Bijapuri relations with Shah Abbas", Islamic Culture, Hyderabad سے شائع ہوا۔

''ھئیات ھای سیاسی عادل شاہی بہ دربار شاہ عباس صفوی'' مقالے میں پروفیسر نذیر صاحب لکھتے ہیں کہ گولکنڈہ، احمد نگر کے حکمرانوں کی مانند بیجاپور کے عادل شاہیوں کے بھی صفوی بادشاہوں خصوصاً شاہ عباس سے صمیمانہ روابط تھے اور انہیں روابط کی بنا پر ان کے مابین سفرا اور ایلچیوں کا رد و بدل ہوتا رہتا تھا۔ حتیٰ دکنی فرمانروا مغل بادشاہوں کی دست درازی کے معاملات میں شاہ عباس سے مدد کے خواستگار ہوتے تھے۔ اس مقالے میں تاریخ عالم آرای عباسی، تزک جہانگیری، فتوحات عادل شاہیہ، مجموعہ مکاتیب سلاطین صفویہ، زندگانی شاہ عباس تالیف نصر اللہ فلسفی جیسی تواریخ کے حوالوں سے عادل شاہیوں اور صفوی بادشاہ کے سیاسی روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ عالم آرای عباسی میں درج ہے کہ دکن کی تینوں سلطنتوں یعنی عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی نے شاہ ایران کے پاس اپنے اپنے سفیر اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہ بادشاہ جہانگیر پر دباؤ

ڈالیں تا کہ مغل بادشاہ ان سلطنتوں کی تسخیر کا ارادہ ترک کردے۔ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی طرف سے خوشنویس خلیل اللہ کو اور دوسرے سلطنتوں نے بھی اپنے اپنے سفیر تحائف کے ساتھ صفوی دربار میں بھیجے۔ سلاطین صفویہ اور تیموریہ کے درمیان ہمیشہ سے دوستی اور اتحاد مستحکم تھا۔ اس بنا پر شاہ عباس نے ایک محبت نامہ ہندوستان کے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا جس میں سلاطین دکن کی سفارش کی گئی۔ بادشاہ جہانگیر نے شاہ ایران کی رضا جوئی کی خاطر سلاطین دکن سے مخاصمت کا ارادہ ترک کردیا۔

پروفیسر صاحب کا ایک اور مضمون ''ابراہیم عادل شاہ ثانی پیشتاز فرہنگ مشترک'' کے عنوان سے قند پارسی ویژہ نامہ استاد نذیر احمد، شمارہ ۵۵۔۵۸ میں شائع ہوا۔ جس میں آپ نے مجموعی طور پر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی خصوصیات، اس کے عہد کی فرہنگی، ادبی، تاریخی، معماری، نقاشی، مصوری غرض کہ ہر پہلو پر طائرانہ نظر ڈالی ہے۔

مختصر یہ کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ایسے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن تک کسی کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ ان کے علمی و تحقیقی مضامین ہر جگہ بڑے ذوق وشوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور شائقین علم وادب ان سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ان کی خدمات کا جائزہ لینا خود ایک بڑا علمی کام ہے۔ انہوں نے فارسی زبان وادب کے میدان میں جو گراں بہا اضافے کیے ہیں وہ قابل فخر اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

حواشی:

۱۔ اندگی نامہ وخدمات علمی وفرہنگی استاد نذیر احمد، ص ۱۹۔۲۰

۲۔ کارنامۂ نذیر، ص ۲

۳۔ کتاب نورس، ص ۵

۴۔ ایضاً، ص ۶

۵۔ کارنامۂ نذیر، ص ۵۹

۶۔ کتاب نورس، ص ۱۱۳

کتابیات

۱۔ نذر ذاکر، مجلس نذر ذاکر، نئی دہلی، مطبع لبرٹی پریس، دہلی، ۱۹۶۰ء
۲۔ کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، شعبہ فارسی، دانشگاہ دہلی، ۱۹۹۵ء
۳۔ کتاب نورس، ڈاکٹر نذیر احمد، دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
۴۔ زندگی نامہ وخدمات علمی وفرہنگی استاد نذیر احمد، انجمن آثار ومفاخر فرہنگی، تہران، اردیبہشت ماہ، ۱۳۸۲ھ ش
۵۔ تحقیقی مطالعے، ڈاکٹر نذیر احمد، دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء

محمد قمر عالم

۱۹۴۷ء کے بعد فارسی تذکروں کی تصحیح و تدوین میں اساتذہ علی گڑھ کی خدمات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کا ابتدا سے ہی اپنی علمی وادبی خدمات کے لئے ہندوستان میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ فارسی اس کے قیام سے ہی وجود میں آگیا تھا جس کو شبلی جیسے نامور نقاد اور محقق نے اپنی علمی وادبی کاوشوں سے توجہ کا مرکز بنایا۔ اس کے بعد سے شعبہ فارسی علی گڑھ سے پروفیسر ہادی حسن، راجہ غلام سرور، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر وارث کرمانی، پروفیسر نبی ھادی سے لیکر پروفیسر آذرمی دخت صفوی جیسے قابل فخر اساتذہ، ممتاز دانشور، نامور محقق، عمدہ مقرر، شہرۂ آفاق تنقید نگار اور قابل قدر مصنف اور مولف وابستہ رہے ہیں۔ جنھوں نے اپنی علمی وادبی خدمات اور کارناموں سے نہ صرف خود کو دنیائے فارسی ادب سے روشناس کروایا، ساتھ ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کو بھی دیگر فارسی مراکز کی فہرست میں ممتاز حیثیت کے ساتھ شامل کروایا۔

زیر نظر مقالے میں راقم نے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کے ذریعہ تصحیح شدہ فارسی تذکروں کا تعارف پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ آزادی کے بعد سے مسلم یونیورسٹی میں فارسی ادب کے میدان میں مختلف موضوعات سے متعلق گراں قدر مطبوعات منظر عام پر آئیں ہیں۔ ان سب

سے الگ یہاں پر فارسی زبان کے کئی اہم تذکرے بھی شائع ہوئے جن کا فارسی تذکرہ نگاری میں اپنا ایک منفرد مقام ہے، جن میں خصوصاً تذکرہ بحر ذخار، تذکرہ عرفات العاشقین، تذکرہ اخبار الجمال، تذکرہ اقتباس الانوار، تذکرہ طبقات شاہ جہانی وغیرہ شامل ذکر ہیں. سب سے پہلے پروفیسر نذیر احمد صاحب نے فارسی زبان کے کئی نادر تذکروں کو اپنے مقالات کے ذریعہ دنیائے فارسی ادب سے روشناس کروایا. آپ نے 'علمائے بلخ' جیسے اہم تذکرے کو فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا. نذیر صاحب کا بیشتر کام محققانہ ہے. کچھ کام ترجمہ کا بھی ہے. فارسی زبان و ادب کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر نذیر صاحب نے خامہ فرسائی نہ کی ہو. بقول پروفیسر شریف حسین قاسمی:

> ''نذیر صاحب نے فارسی زبان و ادب کے گونا گون اہم موضوعات پر علمی ،تحقیقی اور تاریخی کام انجام دیئے ہیں. آپ کے علمی کاوشوں کا مناسب طور پر جائزہ وہ ہی صاحب نظر عالم لگا سکتا ہے جو ایران و ہند کی کسی سیاسی ،سماجی ،ثقافتی ،تہذیبی اور ادبی تاریخ سے کما حقہ واقف ہو.''

جیسا کہ ہم فارسی ادب کے طالب علم بخوبی واقف ہیں کہ پروفیسر نذیر صاحب نے فارسی تذکروں کو متعارف کرانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں. آپ نے فارسی کے نادر نسخوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جن میں 'تذکرہ فضلای بلخ' کا اردو ترجمہ و تلخیص بھی ایک اہم کارنامہ ہے. یہ تذکرہ اصل میں عربی زبان کی تصنیف ہے جس کے مولف شیخ الاسلام صفی الدین ابوبکر عبد اللہ بن عمر بن داوود واعظ بلخی ہیں. ۶۷۶ھ میں فارسی کے ممتاز ادیب شیخ عبد اللہ محمد بن حسین بلخی نے بلخ کے حکمران ابوبکر عبد اللہ کی خواہش پر، بمقام بلخ عربی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا. نذیر صاحب نے اس اہم تذکرہ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا جو کہ ۱۹۸۹ء میں اردو ترقی بورڈ ،نئی دہلی سے شائع ہوا. علمائے بلخ کے اس اہم تذکرے کی تلخیص و صاحب ترجمہ عبد اللہ محمد حسین بلخی کے احوال کو پروفیسر نذیر احمد صاحب نے دیگر فارسی تاریخ کے حوالے سے بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے. صاحب ترجمہ نے فارسی میں کئی روایات، حکایات اور احادیث کو بھی شامل کیا تھا جن میں سے صرف چند ہی کو نذیر صاحب نے اپنے اردو ترجمہ میں صرف تاریخی شواہد کی بنیاد پر شامل کیا ہے بقیہ کو صرف نظر کیا گیا ہے. جن شخصیات کا متن میں ضمناً ذکر آیا ہے نذیر

صاحب نے حاشیہ میں مختصر معلومات فراہم کی ہیں جس سے نذیر صاحب کی علمی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر نذیر صاحب اس ترجمہ کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں ایک سیمینار میں شرکت کے لئے کابل جانا ہوا۔ سیمینار سے فراغت کے بعد شہر بلخ گئے۔ موجودہ علاقہ کا منظر دیکھنے کے بعد بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ یہ وہ شہر بلخ ہے جو کبھی اسلامی حکومت کی شان وشوکت ہوا کرتا تھا آج یہاں ویرانہ ہے۔ سب کچھ اجڑ گیا ہے۔ اس سرزمین نے ایک سے بڑھ کر ایک عالم وفاضل بخشے ہیں۔ سفر سے واپسی پر بلخ کی خرابی کا دل پر اثر باقی تھا۔ اسی دوران کتاب 'فضائل بلخ' مطالعہ میں آئی پہلے اس پر ایک مضمون لکھنے کا خیال ہوا بعد میں رائے بدل گئی اور پوری کتاب کی تلخیص زیادہ سود مند نظر آئی۔ چنانچہ چند روز کی کوشش سے یہ کام پورا ہو گیا اور اس طرح قارئین کرام کی خدمات میں اسلامی تاریخ کے چند عبرتناک صفحہ پیش کرنے کا موقع ملا۔

تذکرہ بحر ذخار از سید وجیہ الدین اشرف، بتصحیح و تدوین: پروفیسر آذرمی دخت صفوی: تذکرہ بحر ذخار بارہ ویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف شیخ وجیہ الدین اشرف کا تعلق لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ بحر ذخار صوفیائے ہند و ایران کا ایک اہم وضخیم تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بحر ذخار میں مصنف نے نہ صرف ہند و ایران کے معروف صوفیا کے احوال درج کئے ہیں بلکہ اپنے عہد کے بھی تمام صوفیاء کے احوال وافکار کو بھی درج کیا۔ مولف نے تصوف کو ایک بحر کی مانند تصور کیا ہے۔ اسی نسبت سے انہوں نے اس کو لجہ، موج، نھر، رود اور شعبہ میں تقسیم کیا ہے۔

تذکرہ بحر ذخار آٹھ لجوں پر مشتمل ہے:

لجۂ اول میں ۲۲ موج ہیں جسمیں رسول اکرم ﷺ، ازواج مطہرات، خلفای راشدین، عشرہ مبشرہ، اصحاب صفہ، اصحاب بدر، صحابہ رسول وغیرہ کے احوال درج ہیں۔

لجۂ دوم: اس میں ۲۴ موج ہیں جو کہ حضرت امام علیؑ، حضرت فاطمۃ الزہراء، امام شہیدان حضرت حسینؑ، شہدای کربلا، تابعین، محبین پیغمبر، محدثین، مجتہدین وغیرہ کے احوال پر مشتمل ہے۔

لجۂ سوم: اس لجہ میں ۳۷ موج ہیں: دونھر، مختلف رود اور کئی شعبہ موجود ہیں۔ اس لجہ میں صوفیہ کے سلاسل اور افکار موجود ہیں۔ حضرت امام حسن بصری سے لے کر حضرت نظام الدین

اولیا محبوب الٰہی، حضرت مخدوم صابر کلیری تک کے احوال درج ہیں.

لجۂ چہارم: اس لجہ کو مصنف نے چار نہر میں تقسیم کیا ہے. نہر اول میں چشتیہ صوفیاء کرام ،دوم میں قادریہ، سوم میں سہروردیہ اور چہارم میں فردوسیہ سلسلے کے احوال پر مشتمل ہے.

لجۂ پنجم: اس لجہ کو پانچ نھر میں تقسیم کیا ہے

لجۂ ششم: اس لجہ میں متقدمین اور متاخرین عرفا جن کے سلسلہ نا معلوم ہیں کے احوال درج ہیں ۔ مولف نے ان صوفیا کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے. جسمیں حضرت سید اعز الدین، ابوسعید تبریزی، ابوبکر موی تاب، شاہ محمد پناہ قادری، تاج الدین بلگرامی، صحر بن صباح سنبھلی، محمود سنبھلی وغیرہ قابل ذکر ہیں.

لجۂ ہفتم: اس لجہ میں مولف نے مجاذیب اولیا کے احوال کا ذکر کیا ہے. ہر سلسلہ کے مجذوب اولیاء کا ذکر کے ساتھ انکے احوال وکرامات بیان کئے ہیں. جسمیں حضرت محمد اسحاق شاہ جہان پوری، بابا فرح تبریزی، شاہ شرف بوعلی قلندر، محبوب علی مجذوب، شاہ عبد الواحد مجذوب، محمد اعظم سنبھلی وغیرہ قابل ذکر ہیں.

لجۂ ہشتم: اس لجہ میں مولف نے حضرت رسول اکرم ﷺ کے عہد سے لے کر اپنے زمانے تک کی تمام نیک، صالح اور عارف عورتوں کے احوال درج کئے ہیں. جسمیں حضرت فاطمہ ،حضرت ام ہانی بن ابی طالب، حضرت سکینہ، حضرت زاہدہ، حضرت زبیدہ، حضرت میمونہ، والدہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی، خواہر ذوالنون مصری، والدۂ شیخ گنج شکر کے علاوہ ۵۰ سے زائد صالحات کا ذکر کیا ہے.

تذکرہ بحر ذخار کے قلمی نسخے کئی کتب خانوں میں دستیاب ہیں پروفیسر صفوی نے اس تذکرے کے متن کی تصحیح کے لئے جن قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے ان میں نسخہ کتابخانہ آزاد، سبحان اللہ کلکشن، کتابخانہ آصفیہ، موزۂ برطانیہ، لندن، خانقاہ کچھوچھا شامل ہیں. مصحح بحر ذخار نے مولانا آزاد لائبریری میں دستیاب نسخہ کو اساسی نسخہ قرار دیا ہے. جس کی اہم وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تمام نسخوں میں سب سے کامل ہے. نسخہ کی طباعت کی تاریخ بھی زمانہ مولف سے قدیم تر ثابت ہوتی ہے. دیگر دو نسخوں کو تصحیح کے طور پر بخوبی استعمال کیا گیا ہے. نسخۂ اساسی کو بہ عینیہ نقل نہیں کیا گیا ہے البتہ جہاں اختلافات نظر آتے ہیں صحیح متن کو جگہ دی گئی ہے. اختلافات کو صفحہ کے آخر میں حاشیہ

دے کر درج کیا گیا ہے. بحر ذخار کی طباعت میں خانم پروفیسر نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ اگر کہیں کہیں متن کرم خوردہ ملا ہے اور بات مکمل نہیں ہو پاتی تو دیگر نسخوں کے ذریعہ متن کو مکمل کیا گیا ہے. کہیں کہیں مصحح نے دو bracket دیگر اپنی جانب سے بھی متن کی تصحیح کی ہے.

پروفیسر آذرمی دخت صفوی کی کاوشوں سے بحر ذخار جیسا ضخیم تذکرہ مرکز تحقیقات فارسی علی گڑھ اور مرکز تحقیقات فارسی خانہ فرہنگ دہلی سے تین نہایت خوبصورت جلدوں میں شائع ہو چکا ہے. تینوں جلدوں میں موجودہ صفحات کی تعداد تقریباً ۲۵۰۰ سے بھی زائد ہوگی جس کو دیکھنے سے اس کے پیچھے کی گئی محنت اور دیدہ دوزی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے. بہر حال بحر ذخار کی طباعت فارسی تذکرہ نگاری کے ساتھ ساتھ فارسی متصوفانہ ادب میں ایک بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے ہم محبان فارسی ہمیشہ پروفیسر صفوی کے ممنون و مشکور رہیں گے.

تذکرہ اخبار الجمال تالیف راجی محمد کولوی، بتصحیح و تدوین پروفیسر آذرمی دخت صفوی: تذکرہ اخبار الجمال فارسی ادب کے اہم و نادر تذکروں میں شمار ہوتا ہے. تذکرہ کے اہم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شہر علی گڑھ میں موجودہ صوفیا کرام کے احوال درج ہیں جو کہ دیگر تذکروں میں کمیاب ہیں. یہ تذکرہ اصل میں علی گڑھ کے ایک بڑے صوفی بزرگ حضرت شیخ جمال شمس العارفین اور انکے خلفاء و خاندان کی تاریخ پر مشتمل ہے. جس کو شیخ راجی محمد کولوی (جن کا تعلق خود حضرت شیخ جمال کے خاندان سے تھا) نے ۱۲ ویں صدی ہجری میں مرتب کیا تھا. اس اہم تذکرے کو پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے تصحیح و تدوین کے ساتھ ۲۰۱۴ میں مرکز تحقیقات فارسی علی گڑھ اور مرکز تحقیقات فارسی خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے تعاون سے شائع کیا.

تذکرہ اخبار الجمال کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے احوال سے ہوتا ہے. حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت اسماعیل سے لیکر حضرت ہاشم، عبد المطلب بن ہاشم، عبد اللہ بن عبد المطلب اور پھر سرکار دو عالم رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک کے احوال درج کیے ہیں. اس کے بعد سے اولاد پیغمبر ﷺ، خلفائے راشدین، ائمہ کرام، شہدائے کربلا وغیرہ کے احوال درج ہیں.

اس کے بعد مولف اخبار الجمال نے 'بیان سلسلہ قادریہ' کے عنوان سے شیخ معروف کرخی سے لیکر حضرت غوث الثقلین عبد القادر جیلانی، اولاد حضرت غوث الاعظم، ان کے خلفاء و

سلسلہ قادریہ کے دوسرے صوفیاء کے احوال درج کیے ہیں۔اس کے بعد 'بیان سلسلہ چشتیہ' کے عنوان سے حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید سے آغاز کرتے ہوئے حضرت خواجہ معین الحق والدین چشتی ان کے خلفاء سے لیکر شاہ بدھا تک چشتیہ سلسلہ کے صوفیاء کے احوال شامل کئے ہیں۔ 'بیان سلسلہ فردوسیہ' کے باب میں شیخ عبداللہ نساج، شیخ احمد غزالی، شیخ نجیب سہروردی سے لے کر سید غازی بن سید گھاسی تک کے صوفیا کے احوال درج ہیں۔ بیان سلسلہ سہروردیہ کے باب میں اس سلسلہ کے تمام صوفیاء کرام کو شامل کیا ہے۔اس کے بعد بیان مشائخ سلسلہ شیخ ابوسعید ابوالخیر بہ سہ جہات کے عنوان سے اہم صوفیاء کرام کے احوال پیش کئے ہیں۔ان ہی میں شیخ جمال شمس العارفین کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خلفاء، مریدین اور اولادوں کے احوال درج کئے ہیں۔صوفیاء کرام کے احوال کے ساتھ ساتھ حضرت راجی محمد نے اس تذکرے کے آخر میں قصبہ کول کی تاریخ، اس میں موجودہ قلعہ کی تاریخ، مسجد جامع، مینار کول، سکان کول، سکان قرب و جوار کول، مزارات مشاہیر کول وغیرہ کے احوال بھی درج کر کے اس کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کیا ہے۔شہر علی گڑھ کی تاریخ سے متعلق اہم مآخذ میں تذکرہ اخبارالاجمال کا شمار ہوتا ہے۔

تذکرہ اخبارالاجمال کی تصحیح وتدوین میں پروفیسر صفوی نے متن کی تصحیح کے تمام اصول و ضوابط کا حق ادا کیا ہے۔مقدمہ مولف اور اصلی متن سے پہلے ایک پرمغز مقدمہ پیش کیا گیا ہے۔جس میں احوال مولف، تذکرہ کی اہمیت وافادیت، اس کے نسخوں کی تفصیل، متن کی تصحیح سے متعلق دیگر اہم اطلاعات درج ہیں۔تذکرہ اخبارالجمال اور اس کے مولف وتذکرے کی وجہ تالیف کے بارے میں پروفیسر صفوی یوں رقم طراز ہیں:

"تذکرہ اخبار الجمال کہ پیش نظر دارید ھدیۂ عقیدت و ارادت مولف راجی محمد کولوی بہ شیخ شاہ جمال جد گرامی خود بطور صوفیای دیگر خانوادہ اش و صوفیان صادق ھند و ایران می باشد .مولف در این تذکرہ ارزش مند احوال و افکار و اقوال و کرامات صوفیای کرام را با کاوش و سعی تمام ترجمع آوری کردہ اطلاعات معتبر و مفصل دربارۂ آنہا فراھم آوردہ است .عدہ ای زیادی از آن بہ منطقہ کول ھند و خانودہ شاہ جمال کولوی تعلق دارد .علاوہ بر این

اخبار الجمال راجع به سلسله های مختلف تصوف هم تشریحات و توضیحات بسیار سودمند را دارا سی باشد که برای علاقه مندان این زمینه اهمیت ویژه دارد."

خانم پروفیسر صفوی نے اپنے مقدمہ میں احوال مولف ،اس کے خانوادے ،تولد ،وفات ،اورآثارراجی کولوی کوعنوان کے ساتھ تفصیل سے اطلاعات درج کی ہیں.

اس کے بعد تذکرۂ اخبار الجمال کے سبب تالیف ،زمان تالیف ،سال اتمام ،مآخذ و منابع کی تفصیل ،ارزش واہمیت اخبار الجمال ،اہمیت صوفیای کول درصوفیای ہند ،اطلاعات تاریخی اور سبک نگارش کے عنوان سے نہایت پرمغز اور کارآمد بحث کی ہے .اس تذکرے کی تصحیح کے لئے مصحح نے چار نسخوں سے استفادہ کیا ہے .اس تذکرے کی تصحیح کے لئے مصحح نے چار نسخوں سے استفادہ کیا ہے .سب سے اہم اور قدیم نسخہ جوکہ مولف کے خانوادے کی ملکیت میں ہے کوحاصل کر کے اسکو اساسی نسخہ قرار دیا گیا .ایک نسخہ مولانا آزادی لائبریری ،ایک نسخہ نواب مزمل خاں کی ذاتی کتب خانہ سے اور ایک نسخہ ایشیاتک سوسائٹی سے حاصل کر کے متن کی تصحیح کی گئی ہے.

تذکرہ عرفات العاشقین :عہد جہانگیری کا ایک اہم ونادر تذکرہ 'عرفات العاشقین' کا ایک حصہ بتصحیح وتدوین پروفیسر آذرمی دخت صفوی شعبہ فارسی ،علی گڑھ سے شائع ہوا ہے .تذکرہ عرفات العاشقین کی اس جلد میں حرف 'ج' سے لے کر 'ز' تک کے تقریباً ۶۰۰ سے زاید ہندوستانی اور ایرانی شعرا کے احوال وآثار درج ہیں .تذکرہ کے آغاز میں ایک تفصیلی مقدمہ جوکہ مولف کے احوال و ابواب اور فصول کے ساتھ ساتھ تذکرے کی ارزش واہمیت پر مشتمل ہے.

تذکرہ عرفات العاشقین کوتقی اوحدی نے ۱۰۲۴ھ میں بمقام آگرہ تالیف کیا تھا .تذکرہ عرفات العاشقین کوتقی اوحدی نے الفبا کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے .اس ترتیب کوانہوں عرصہ ،غرفہ اور عرفہ کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے .عرصہ میں مولف ایک حرف کومورد بحث قرار دیتے ہیں اس کے بعد غرفہ میں ان کوتین حصوں میں یعنی متقدمین ،متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کرتے ہیں یعنی غرفۂ اول دربارۂ متقدمین ،غرفہ دوم دربارہ متوسطین اور غرفہ سیوم دربارہ متاخرین .ہرغرفہ کو 'عرفہ' کے عنوان سے تقسیم کیا ہے .شاعر سے متعلق احوال بہ عنوان 'عرفہ' ہی پیش کئے ہیں.

تذکرہ عرفات العاشقین کا تعارف پروفیسر نذیر احمد نے بھی ماہنامہ معارف کے جنوری

اور فروری ۱۹۵۶ کے شماروں میں بعنوان 'عہد جہانگیری کا ایک اہم مصنف وشاعر یعنی تقی اوحدی اصفہانی صاحب عرفات العاشقین' پیش کیا.اس مضمون میں نذیر صاحب نے تقی اوحدی کے نسب و خاندان ،وطن ،جائے پیدائش ،ابتدائی تعلیم و تربیت ،سفر شیراز، اصفہان ،سفر ہند ،قیام لاہور ،گجرات وآگرہ ،وفات ،معاصرین سے تعلقات ،معاصرین میں آقا تقی معزالدین ،عرفی شیرازی ،سحر کاشانی ،معیت محوی وغیرہ سے تعلقات کا بیان کیا ہے.نذیر صاحب فرماتے ہیں:

"تقی اوحدی دسویں اور گیارہویں صدی کا ایک اہم مصنف ہے.جس نے فارسی نظم و نثر میں اپنے کمال کی بہت سی یادگار چھوڑی ہیں بدقسمتی سے اس کی ساری تصنیفات دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئیں .صرف ایک تذکرہ عرفات العاشقین باقی رہ گیا ہے اور وہ بھی اس حد تک نادر و نایاب ہے کہ اس کے صرف ایک نسخہ کا اب تک پتہ چل سکا ہے ،مگر یہ تذکرہ اتنا اہم ہے کہ اسے فارسی ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے اور محض اسی کتاب کی بدولت تقی کا نام مدتوں روشن رہے گا.اس تذکرے کی اہمیت کے پیش نظر مصنف کے حالات وواقعات کو یکجا کر دیا گیا ہے"۔

اسکے علاوہ عرفات العاشقین مکمل آٹھ جلدوں میں انتشارات میراث مکتوب ،تہران سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

تذکرہ اقتباس الانوار تالیف محمد اکرم برانسوی بتصحیح وتدوین ڈاکٹر محمد احتشام الدین .علی گڑھ سے شائع ہوئے فارسی تذکروں میں ایک اہم نام تذکرہ اقتباس الانوار کا بھی ہے.جس کے مولف محمد اکرام برانسوی ہیں تذکرے کی تصحیح وتدوین کا کام فارسی کے استاد ڈاکٹر محمد احتشام الدین نے انجام دیا ہے.یہ تذکرہ ان کی محنت اور علمی کاوشوں سے چند ماہ قبل ہی مرکز تحقیقات فارسی ،علی گڑھ سے شائع ہوا ہے.

تذکرہ اقتباس الانوار کے مولف محمد اکرم برانسوی ۱۱۳۲ء ،بمقام دہلی اس کی ترتیب کا آغاز کیا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ صرف چار ماہ کی مدت میں ہی اس کو مکمل کرلیا تھا .پروفیسر نبی ہادی صاحب نے اس کی تالیف ۱۱۴۲ھ درج کی ہے.ریو کی کٹلاگ میں بھی نسخہ کا آغاز ۱۱۳۵ سے اور اختتام ۱۱۴۲ درج ہے ،شاید نبی ہادی صاحب نے اسی کے حوالے کو پیش کیا ہے مگر احتشام الدین صاحب نے اپنے عمیق مطالعہ اور دقت نظر سے تذکرے کے آغاز میں شامل اپنے مقدمے میں دلائل کے ساتھ اصل تالیف ۱۱۳۲ھ ثابت کی ہے.نسخہ کی تصحیح کے لئے تین نسخوں

کی دستیابی معلوم ہوتی ہے .ایک رام پور رضا لائبریری میں دو نسخہ علی گڑھ کی لائبریری کے سبب نسخہٗ اساسی بنایا گیا ہے . بقیہ نسخوں سے موازنہ کر کے بالکل صحیح متن تیار کیا گیا ہے اختلاف نسخ کو صفحہ کے آخر میں حاشیہ دے کر درج کیا ہے .

مولف اقتباس الانوار نے تذکرے کو ایک جامع مقدمہ اور چار اقتباس میں پیش کیا ہے .ہر اقتباس کو 'نور' کے عنوان سے مختلف باب میں تقسیم کیا ہے . محمد اکرم نے مقدمہ میں ذکر خلقت الٰہی ، ذکر چہاردہ خانوادہٗ اصل ، ذکر سیزدہ خانوادہٗ فرع .اسامی رجال اللہ اقطاب وغوث و غیرہ کے احوال درج کئے ہیں .

اقتباس اول میں نور اول بعنوان حضرت رسالت پناہ ﷺ ، نور دوم ذکر خلفائے راشدین ، نور سیوم ذکر ائمہ معصومین کے احوال شامل کئے ہیں .

اقتباس دوم میں کے نور اول میں حضرت امام بصری ، خواجہ عبد الواحد ، ابراہیم ادہم و غیرہ ، نور دوم میں خواجہ ھبیرہ بصری ، خواجہ ابواسحاق چشتی ، ابو محمد چشتی وغیرہ ، نور سیوم میں خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی ، حضرت عثمان ہارونی جیسے نامور صوفیا قابل ذکر ہیں .

اقتباس سوم میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے خلفاء ، مریدین اور چشتی سلسلہ کے دیگر صوفیاء کا ذکر شامل ہے .

اقتباس چہارم کے نور اول میں حضرت عبد القدوس گنگوہی ، نور دویم میں شیخ ابو سعید گنگوہی ،، شیخ محمد صادق گنگوہی ، نور سویم میں شیخ اللہ بخش براسوی جد پدری مولف تذکرہ اور شیخ علی ابن شیخ اللہ پدر گرامی کا ذکر شامل ہے .

شیخ محمد اکرم نے تذکرے کو ترتیب دینے میں جن مآخذ کا استعمال کیا ہے ان میں مرآۃ الاسرار ، سیر الاقطاب ، سیر الاولیاء ،، بحر المعانی ، روضۃ الشہداء ، روضۃ الصفا ، حبیب السیر ، لطائف اشرفی ، کشف المحجوب ، سیر العارفین ، اخبار الاخیار ، اسرار السالکین وغیرہ قابل ذکر ہیں .

اقتباس الانوار صوفیاء کا ایک اہم اور ضخیم تذکرہ ہے .جس کی ابھی ایک جلد ہی شائع ہوئی ہے اور ڈاکٹر احتشام الدین کے مطابق انشاء اللہ جلد ہی اس کی دوسری جلد بھی شائع ہو جائے گی .

بلاشبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی اساتذہ نے فارسی زبان وادب کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں .شعبہ کے قیام سے لیکر آج تک تمام اساتذہ فارسی زبان وادب

کے مختلف موضوعات سے متعلق اپنی تخلیقات پیش کرتے آرہے ہیں. مگر چونکہ اس مقالہ میں صرف تذکرہ کے حوالے سے اطلاعات پیش کرنا مقصد تھا لہذا دیگر فارسی مطبوعات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے.

حوالہ:

۱. تذکرہ علمای بلخ، مترجم پروفیسر نذیر احمد، ترقی اردو بیورو، نئی دھلی، ۱۹۸۹

۲. بحر ذخار تالیف سید وجیہ الدین اشرف، بتصحیح و تدوین، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، مرکز تحقیقات فارسی، ایران کلچر ھاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۴

۳. اقتباس الانوار تالیف محمد اکرم برانسوی، بتصحیح وتدوین ڈاکٹر محمد احتشام الدین، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۶

۴. اخبار الجمال تالیف راجی محمد کولوی، بتصحیح وتدوین پروفیسر آذرمی دخت صفوی، مرکز تحقیقات فارسی، ایران کلچر ھاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۴

۵. عرفات العاشقین تالیف تقی اوحدی، بتصحیح وتدوین پروفیسر آذرمی دخت صفوی، شعبہ فارسی، علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

بابائے فارسی پروفیسر نذیر احمد (مرحوم)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہندوستان میں صدیوں تک فارسی زبان وادب کا رواج رہا اور یہ زبان یہاں کی درباری اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے اس سرزمین پر اپنی سالمیت کا جوہر دکھا چکی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سبھی نے مل کر اس کو بام عروج تک پہنچایا جس کے نتیجے میں ایک ایسی تہذیب کی تشکیل وجود میں آئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کے نام سے جانتے ہیں۔

انگریزوں کی آمد کے بعد مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ خوبصورت زبان بھی گوشۂ گمنامی میں چلی گئی اور یہاں کا ادبی سرمایہ منتشر ہوگیا۔ اس کو یاد کرنے والی اور اس کی حفاظت کرنے والے کچھ ادب پرور اور ادب شناس شخصیات رہ گئیں جنھوں نے اپنی علمی اور تحقیقی کاوشوں سے نہ صرف اس کو زندہ رکھا بلکہ اسے جاودانی بھی عطا کی۔ ان ادیبوں میں خاص طور پر علامہ شبلی نعمانی، پروفیسر نبی ہادی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر قاضی عبدالودود وغیرہ کے نام سرفہرست آتے ہیں۔

پدم شری پروفیسر نذیر احمد ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی وہ ممتاز اور ماہر شخصیت گزرے ہیں جنھوں نے دل وجان سے فارسی کی بیش بہا خدمات انجام دیں، اس کے پوشیدہ ذخائر کو

گوشۂ گمنامی سے باہر نکلا اور اپنی لافانی تحقیق وتنقید کے بعد ادب کی دنیا میں روشناس کیا اور فارسی ادب میں اپنا ایک اعلیٰ اور منفرد مقام بنایا، اپنے علمی وادبی کارناموں کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ایران میں بھی شہرت پائی۔ ایران میں آپ کو بڑی قدر ومنزلت اور احترام سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ آپ پہلے ہندوستانی دانشور ہیں جنھیں ایران سے ڈی۔لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا گیا آپ کے علمی کارنامے بے شمار ہیں جن کا ذکر کرنا سورج کو چراغ دیکھانے کے مترادف ہے۔

ذیل میں مختلف محققین ادب کے ان اقوال کو نقل کیا جاتا ہے جو پروفیسر موصوف کی شان میں کہے گئے ہیں یہ صرف اقوال ہی نہیں ہیں بلکہ وہ نذرانے ہیں جو عقیدت مندوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں۔

ایران علماء وفضلاء ان کا ویسا ہی ادبِ واحترام کرتے ہیں جیسا سعید نفیسی، محمد معین اور ذبیح اللہ صفا کا

(پروفیسر کبیر احمد جائسی)

فارسی ترتیب وتدوین متن کا کام جتنا ہندوستان میں انجام پذیر ہوا اتنا ایران میں نہیں ہوا۔ اس کا سہرا نذیر صاحب کے سر جاتا ہے۔

(علی اکبر ثبوت)

ایک محقق اور دانشور اور استاد کی حیثیت سے پروفیسر نذیر احمد نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں بھی معتبر اور لائق پیروی ہیں۔

(پروفیسر شریف حسین قاسمی)

پروفیسر نذیر احمد ایک ممتاز مخطوطہ شناس ہیں اور فرہنگ شناسی میں وہ بے نظیر ہیں۔ نذیر احمد صرف ایک فرد کا نام نہیں ہے بلکہ وہ خود میں ایک ادارہ ہیں۔

(پروفیسر ماریہ بلقیس)

نذیر احمد صاحب نے ایک تربیت یافتہ مورخ کا کردار ادا کیا ہے۔

(پروفیسر اقتدار حسین صدیقی)

نذیر صاحب پہلے عالم ہیں جس میں علم وعمل، نظر وخبر کا اجتماع ہے۔

(پروفیسر عبدالحق)

سائنٹفک تحقیق میں محمود شیرانی کے بعد پروفیسر نذیر احمد کا نام آتا ہے۔

(پروفیسر آصفہ زمانی)

آپ پیچیدہ الفاظ سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ جب کہ دیگر محقق ثقیل، مشکل الفاظ اور دیگر زبان کا استعمال کرتے ہیں۔

(پروفیسر ظہیر الدین ملک)

گجرات کو علم و ادب میں سب سے پہلے نذیر صاحب نے روشناس کرایا۔

(ڈاکٹر نصار احمد انصاری)

فارسی زبان و ادب کی تحقیق کا معیار جس طرح علامہ قزوینی، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے غور تامل، تلاش و جستجو سے بلند تر ہوا ہے۔ اسے پروفیسر نذیر احمد نے اپنی کوششوں سے بلند تر کیا ہے۔

(پروفیسر سید انوار احمد)

نذیر صاحب کی شخصیت تاریخ ساز ہے۔

(پروفیسر آذر میدخت صفوی)

نذیر احمد استادی است کہ نظیرش پیدا نیست

(پروفیسر عبدالقادر جعفری)

استاد محترم کے کارناموں کا میدان بہت متنوع اور وسیع ہے۔

(پروفیسر شعیب اعظمی)

پروفیسر نذیر احمد ۱۹۱۵ء میں اتر پردیش کے ضلع گونڈا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور اسی گاؤں کے نزدیک ایک پرائمری اسکول میں داخلہ لے کر اپنے علمی سفر کا آغاز کیا اور مڈل تک کی پڑھائی یہیں حاصل کی۔ پھر گونڈا شہر جا کر ہائی اسکول کا امتحان اوّل نمبر سے پاس کیا، اور بقیہ تعلیم حاصل کرنے لے لئے لکھنؤ چلے آئے جہاں انھوں نے منشی کے امتحان میں اوّل درجہ سے کامیابی حاصل کی۔ بی۔ اے میں امتیازی نمبر حاصل کئے اور ایم۔ اے میں بھی امتیازی نمبر حاصل کر کے دو طلائی تمغوں کے حقدار بنے، اس کے علاوہ مزید پڑھائی کے لئے آپ کو وظیفہ بھی موصول ہوا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ہی آپ نے ''احوال و آثار ظہوری (Zahuri life &

works) کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے شعبۂ فارسی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد آپ نے عادل شاہی دور کے فارسی شعراء پر بھی تحقیقی مقالہ پیش کی اور ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کی۔آپ نے صرف اس پر بس نہیں کیا بلکہ ابراہیم عادل شاہ کی کتاب ''نورس'' پر اردو میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا اور اردو بان میں بھی ڈی۔لٹ کی ڈگری پائی۔یہ کارنامہ اپنے آپ میں ایک منفرد کام ہے۔شاید ہی کوئی اس مقام تک پہنچا ہو کہ جس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ڈی۔لٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہوں۔اپنے اس علمی سفر کے دوران آپ ایک مرتبہ ایران بھی تشریف لے گئے جہاں آپ نے تہران یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور فارسی باستان، پہلوی اور جدید فارسی میں ڈپلوما کیا۔

جس زمانے میں آپ تحصیل علم میں مصروف تھے اس دور میں بھی آپ کی درس و تدریس کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ایم۔اے کے بعد آپ کی تقرری گورنمنٹ کالج میں بحیثیت اردو اور فاسی کے استاد کے ہوئی اور تقریباً دس سال تک اسکول کے معلم و مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ڈی۔لٹ کی ڈگری پانے کے بعد آپ کا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں بحیثیت لکچرر کے ہوا۔اور ۱۹۵۷ء میں آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تاریخ ادب اردو کے اسسٹنٹ دائرکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے جہاں آپ تقریباً سوا سال تک مقرر رہے پھر ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ریڈر کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد آپ پروفیسر ہوئے۔۱۹۶۰ء میں صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔تقریباً ۱۹۷۷ء تک اس شعبہ کی مختلف شکلوں میں خدمات انجام دیتے رہے۔۱۹۶۹ء میں آپ آرٹس فیکلٹی کے ڈین بھی بنے۔ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد غالب انسٹی ٹیوٹ کے لائف ٹرسٹی ہوئے اور غالب پر مختلف تحقیقی کتابیں منظر عام پر لائے۔ان بڑی خدمات کے علاوہ آپ کا سارا وقت کتابوں کے مطالعہ، مخطوطات کی تحقیق میں صرف ہوتا تھا۔آپ کے ذریعہ تحقیق شدہ کتابیں موجودہ اور آنے والوں کیلئے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔تحقیق کے علاوہ آپ اپنا قیمتی وقت ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی میں گزارتے تھے۔آپ نے پروفیسر وارث کرمانی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر طارق حسین، پروفیسر آذرمیدخت صفوی، ڈاکٹر معتصم عباسی اور ڈاکٹر زہرا عرشی جیسے ہونہار شاگردوں کی رہنمائی کی جنھوں نے اپنے استاد گرامی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فارسی

زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان میں سے چند داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں اور کچھ آج بھی فارسی زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ موجودہ دور میں اپنے استا کے نقش قدم پر چلنے والوں میں پروفیسر آذرمیدخت صفوی کا نام سرفہرست ہے خوش قسمتی سے جو راقمہ ان کی شاگردی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔

بہر حال تحقیق کی دنیا میں علامہ شبلی نعمانی کے بعد جناب نذیر صاحب کا ہی نام آتا ہے۔ بلکہ فارسی متون کی تدوین کا نقش اوّل پدم شری پروفیسر نذیر احمد کو تسلیم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ نادر مخطوطات کی بازیافت، ان کے مصنفین ومرتبین کے سلسلے میں آپ نے ایسی ایسی اطلاعات فراہم کی ہیں جن کے بارے میں محققین کو قطعی طور پر علم نہ تھا۔ آپ نے بے شمار شخصیات اور لاتعداد مخطوطات کی بازیافت کی جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ بے نظیر ہے آپ کے متنی تحقیق کے نمونے: دستور الافاضل، دیوان حافظ شیرازی، مکاتیب سنائی، دیوان سراجی خراسانی، فرہنگ قواس، فرہنگ زفان گویا، نقد قاطع برہان، فرہنگ لسان الشعراء، دیوان مہندس، اعجاز خسروی، دیوان عمید لویکی، تحقیقی مقالے، تاریخی اور ادبی مطالعے، کتاب الصیدنہ، مقالات علمی وتاریخی، فضلائے بلخ، غالب پر چند مقالے، فارسی قصیدہ نگاری، دیوان حافظ فارسی میں بر مخطوطہ مجموعہ لطائف وسفینۂ ظرائف، مجموعہ لطائف وسفینۂ ظرائف پر لکھے گئے مقالات اور دیگر متفرق مضامین پر لکھے گئے مقالات کی شکل میں موجود ہیں۔ راقمہ نے ''مجموعۂ لطائف وسفینۂ ظرائف'' کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ مکمل کیا اور آپ کے مضامین سے کافی حد تک استفادہ کیا۔ چونکہ ''مجموعہ لطائف وسفینۂ ظرائف'' آپ ہی کی بازیافت ہے اسلئے اس بیاض کے سلسلہ میں آپ سے مشورہ لینے آپ کے گھر بھی جایا کرتی تھی۔ یہ واقعہ ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء کے درمیان کا ہے۔ حالانکہ اس وقت آپ کی طبیعت کافی ناساز رہتی تھی اور آپ علمی کاموں سے مکمل طور پر سبکدوش ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے گرانقدر مشوروں سے راقمہ کی رہنمائی کی جس کے لئے راقمہ تاعمر آپ کی مرہون منت رہے گی۔ ۲۰۰۸ء میں آپ نے اس دار فانی سے رخصت پا کر داعی اجل کو لبیک کہا ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون '' آپ کے عزیز واقارب اور شاگردوں نے پر نم آنکھوں کے ساتھ آپ کے جسد خاکی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا۔ اس طرح علم کا یہ سرچشمہ مختلف وادیوں کو سیراب کرتا ہوا خالق حقیقی سے جا ملا۔

منابع:

۱۔ مقالات نذیر احمد — مرتبہ: ڈاکٹر ریحانہ خاتون
۲۔ تاریخی و علمی مقالات — مترجم: ڈاکٹر کبر احمد جائسی
۳۔ پروفیسر نذیر احمد در نظر دانشمندان — مرتبہ: پروفیسر ماریہ بلقیس
۴۔ کارنامۂ نذیر — مرتبہ: ڈاکٹر ریحانہ خاتون
۵۔ تحقیقی مقالے — مرتبہ: ڈاکٹر نذیر احمد

علی اکبر شاہ

احمد معمار اور امام الدین ریاضی سے متعلق پروفیسر نذیر احمد کی تحقیقات کا محاسبہ

تاج محل بے شک فارسی تہذیب اور ثقافت کی جانب سے ہندوستانی قدیم تہذیب کیلئے ایک ایسا دائمی تحفہ ہے جوان دو قدیم تمدنوں کی قربت دوستی اور اشتراک کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا رہے گا۔ جہاں تاج محل اپنی بے مثال خوبصورتی اور لازوال عشق ومحبت کی نشانی کی حیثیت سے عجائب دنیا میں شامل ہے وہیں یہ اسرار و رموز کا ایسا مجموعہ ہے جس کی ساری پرتیں ابھی تک کھل نہیں پائی ہیں۔ یہی کم استعجاب اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ ۱۶۵۳ء میں پایۂ تکمیل تک پہونچنے والی اس مثالی عمارت کو اپنے اصلی معمار کے تعین کیلئے تقریباً تین صدیوں تک انتظار کرنا پڑا۔ اس لمبے عرصے میں کئی خوش قسمت لوگوں کا نام اصلی طرّاح کی حیثیت سے تاج محل سے جڑا۔ کچھ محققین نے جیرونیمو ویرونیو اٹلی کے ایک سنار اور کبھی فرانس کے سونے اور چاندی کے زیورات کے تاجر آسٹن دے بُرداکس کو اس اتفاقی اور موقتی اعزاز سے نوازا اور کچھ نے علی مردان خان شاہجہانی دور کے مشہور مہندس کے سر پر یہ سہرا سجایا۔ کمزور شواہد اور مفروضات کی بنا پر سستے میں بٹنے والے اس اعزاز کو حاصل کرنے والوں کی اس فہرست میں چند اور نام بھی شامل ہیں یہ فہرست گنجائشوں، مصلحتوں اور وقت گذرنے کے ساتھ اور بھی طویل ہوتی لیکن ۱۹۳۰ء میں بنگلور

کے ایک محقق سیّد محمود خان کے ہاتھوں دیوان مہندس نامی فارسی مخطوطہ کی کھوج نے کئی لوگوں سے اس اتفاقی خوش بختی کی توفیق اجباری کو سلب کرلیا۔ سیّد محمود اپنے ذاتی کتبخانے میں قلمی نسخوں کی جانچ پڑتال میں مصروف تھے کہ دیوان مہندس نامی اس مخطوطے پر ان کی نگاہ پڑی۔

یہ لطف اللہ مہندس کا دیوان تھا۔ دیوان کی ورق گردانی کے دوران محمود خان کی نگاہ درج ذیل ابیات پر پڑی:

احمد معمار کے در فنِ خویش   صد قدم از اہل ہنر بود پیش
از طرف داورِ گردون جناب   نادر عصر آمدہ او را خطاب
بود عمارت گرِ آن بادشاہ   داشت در آن حضرت فرخندہ جاہ
آگرہ چو شد مضرب رایات شاہ   بس کہ برو بود عنایات شاہ
کرد بحکمِ شہِ کشورکشا   روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکمِ شہ انجم سپاہ   شاہجہان داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کے ندارد نظیر   کرد بنا احمدِ روشن ضمیر
این دو عمارت کے بیان کردہ ام   در صفتش خامہ روان کردہ ام
یک ہنر از گنجِ ہنرہای اوست   یک گہر از کانِ گہرہای اوست

ان ابیات کو دیکھنے کے بعد ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ ایک نہایت ہی اہم اور تاریخی معمے کو حل کرنے کے بہت نزدیک پہونچ چکے ہیں۔ چونکہ ان اشعار میں لطف اللہ مہندس نے صریحاً اپنے والد احمد معمار کو کہ جسے بادشاہ شاہجہاں کی جانب سے نادرِ عصر کا خطاب ملا تھا، تاج محل اور دہلی کے لال قلعے کا معمار قرار دیا ہے، لیکن محمود خان اس بڑی علمی دریافت اور کامیابی کی سندیت سے پورے طور پر مطمئن ہوئے بغیر اسے منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتے تھے لہذا انہوں نے ایک خط کے ہمراہ مخطوطے کو اعظم گڑھ میں سیّد سلیمان ندوی کے پاس بھیج دیا۔ سیّد سلیمان ندوی نے اس دیوان کی دستیابی کو ایک بڑا علمی انکشاف مانتے ہوئے اس میں موجود اسامی کے متعلق مزید معلومات بہم پہونچانے کی غرض سے معاصر معتبر مراجع کی طرف رجوع کیا لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی ہاتھ نہیں لگی اسی دوران ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا معارف اعظم گڑھ میں چھپا ہوا ایک مضمون ان کی نظر سے گذرا جس میں ڈاکٹر چغتائی نے تاج محل اور اس کی تعمیر سے متعلق مختلف

موضوعات پر بحث کی تھی۔ اس مضمون میں احمد لاہوری کا نام ضرور آیا تھا لیکن تاج محل کے اصلی معمار کے طور پر نہیں۔ سیّد سلیمان ندوی نے ۱۱ر مارچ ۱۹۳۱ کو ڈاکٹر چغتائی کے نام ایک استفسارانہ مکتوب ارسال کرتے ہوئے احمد لاہوری کے متعلق ان کی نظر سے گذرنے والے مراجع کی طرف راہنمائی کی درخواست کی، ڈاکٹر چغتائی نے ندوی کی طرف سے پے در پے دو یاددہانیوں کے بعد مسئلے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے جواب میں ذاتی مجموعہ کتب میں موجود شاہجہانی دور کے اس خط کی طرف اشارہ کیا جو کسی نامعلوم فرد کی طرف سے عمدۃ الملوک نواب جعفر خان کو لکھا گیا تھا۔ نواب جعفر خان تب شاہجہاں کی طرف سے پنجاب کے گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس خط میں احمد لاہوری کو شاہجہانی دور کے ایک نہایت ہی تجربہ کار اور بے مثال معمار کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور گورنر کو حکم دیا گیا تھا کہ چونکہ احمد لاہوری کو شمالی ہندوستان میں مختلف تعمیراتی پروجیکٹ کی نظارت کے سلسلے سے متواتر سفر کرنا پڑتا ہے اس لیے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ صوبۂ پنجاب میں اس شاہی معمار کو کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے سیّد سلیمان ندوی نے دیوانِ مہندس میں موجود اطلاعات کی روشنی میں احمد لاہوری اور اس کے خاندان پر ایک مبسوط مضمون لکھا اور اس میں ڈاکٹر چغتائی سے موصول معلومات کا حوالہ بھی دیا۔ سیّد سلیمان ندوی نے یہ مضمون ۹ر مارچ ۱۹۳۳ء کو ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے پہلے جلسے میں لاہور میں پڑھا۔ بعد میں یہ مضمون ۱۹۳۶ سے ۱۹۳۹ء کے درمیان معارف کے پے درپے شماروں میں قسط وار شائع ہوا اور ۱۹۴۸ء میں صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

اس مضمون کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱- احمد لاہوری کا خاندان بابر کے زمانے میں ایشیائے مرکزی سے ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہو گیا تھا۔

۲- احمد لاہوری، عصری علوم، خاص طور سے علمِ ریاضی، علمِ ہندسہ، نجوم، ہیئت اور فلسفہ میں اعلیٰ درجے پر فائز ہونے کی وجہ سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

۳- احمد لاہوری تاج محل اور لال قلعہ دہلی کے معمارِ اصلی تھے۔

۴- احمد لاہوری کے تین بیٹے عطاء اللہ رشید، لطف اللہ مہندس اور نوراللہ معمار بھی اپنے زمانے کے مشہور دانشمند اور فنِ تعمیر میں یکتائے روزگار تھے۔

پروفیسر نذیر احمد نے احمد معمار کے عنوان سے اپنے مبسوط مضمون میں پہلے سے دریافت شدہ حقائق پر خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

مقالے کی ابتدا میں انہوں نے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے اس نظریئے کی تردید کی ہے جہاں انہوں نے احمد لاہوری کو تاج محل کا معمار ماننے سے یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ کیونکہ یہ ابیات صرف دیوان مہندس کے ایک ہی نسخے میں موجود ہیں اسلیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ نے جن تین قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے وہ تینوں میری نظر سے گذرے ہیں اور ناقص ہیں اسلیے ان کا بیان موردِ اعتناء نہیں ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے مقالے میں پہلی بار اکثر محققین سے اختلافِ نظر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ احمد لاہوری کا خاندان ایشیائے مرکزی سے نہیں بلکہ ہرات سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا۔ اس کی دلیل میں انہوں نے مؤلفِ 'تذکرۂ باغستان' امام الدین ریاضی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

''الهروی ثم اللاّ ہوری ثم الدہلوی''۔

نذیر احمد صاحب نے احمد لاہوری کو شاہجہاں کی طرف سے ملنے والے خطاب نادر العصر کے حوالے سے بھی پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ لطف اللہ مہندس کے زیرِ قرأت قرآن کے حاشیے پر یہ تحریر موجود ہے کہ شاہجہاں نے بے مثال اور متنوع صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے احمد لاہوری کو اس خطاب سے سرفراز کیا۔ نذیر احمد صاحب نے 'تذکرۂ باغستان' کی بنیاد پر استاد احمد کا شجرہ بھی تیار کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کے خاندان کے لوگ ابھی بھی موجود ہیں۔ استاد نذیر احمد صاحب نے اپنے مقالے میں بعضی ایسی الحاقی کتابوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کو بعض محققین اور فہرست نگاروں نے اشتباہاً استاد لاہوری سے منسوب کر دیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اس مقالے میں پروفیسر نذیر احمد صاحب نے استاد احمد لاہوری اور ان کے خاندان کے متعلق بعض ایسے گوشوں سے پردہ اُٹھایا ہے جو انہیں کا خاصہ تھا اور شاید یہ کسی اور کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

تذکرۂ باغستان

'تذکرۂ باغستان' امام الدین حسین ریاضی کا تذکرہ ہے جو کہ معمارِ تاج محل نادر العصر استاد احمد معمار

کے پوتے تھے یہ تذکرہ ۱۷۰۴-۱۷۰۸ء کے درمیان تالیف ہوا۔ استاد احمد معمار سے متعلق تحقیقات کے باب میں 'تذکرۂ باغستان' کا کشف پروفیسر نذیر احمد کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ 'تذکرۂ باغستان' کا ایک حصہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ اور ایک حصہ رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ ٹیگور لائبریری والے حصہ سے متعلق اردو ادب ۱۹۵۵، اسلامک کلچر ۵۷-۱۹۵۶ میں شائع مقالات کے ذریعے نذیر صاحب اس تک پہنچ سکے لیکن رامپور والا حصہ خود ان کی تحقیق ہے۔ 'باغستان' مجموعاً بارہ ابواب پر مشتمل ہے جو کہ 'باغ' کے عنوان کے حامل ہیں اور ذیلی ابواب کو 'چمن' کا نام دیا گیا ہے۔ مخطوطہ کے پہلے حصے میں پانچ باغ اور دوسرے حصہ میں باقی کے ۷ باغ ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد نے مخطوطے کے دونوں حصوں کی بے ترتیبی کے باوجود بڑی محنت سے ابواب کے عناوین اور ان کے مطالب کا تعارف پیش کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے دونوں حصوں کے مطالعہ کے نتیجہ میں امام الدین ریاضی کے 'تذکرۂ باغستان' کے منابع و مصادر کی فہرست بھی مرتب کی ہے جو کم وبیش ۸۰ کتابوں پر مشتمل ہے۔ 'تذکرۂ باغستان' جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب ایک مخصوص موضوع کا حامل ہے۔ ان ابواب میں دو باب خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ چھٹا باغ جو کہ مختلف صوفی سلسلوں کے بیان اور صوفیا کے مختصر اور مفصل شرح حال پر مشتمل ہے اور نواں باب جو کہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔ صوفی سلسلوں کے باب میں، سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور شطاری سلسلوں کا مفصل طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں بھی سلسلۂ قادریہ بیشتر تفصیل اور توجہ سے لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے امام الدین ریاضی کا رجحان سلسلۂ قادریہ کی طرف رہا ہو۔ اس کے علاوہ، متفرق صوفیا کے ذیلی عنوان کے تحت بعض مشہور صوفیا کا ذکر کیا گیا ہے جن میں شیخ ابوسعید ابوالخیر، ابراہیم ادہم، شیخ محب اللہ الہ آبادی، بوعلی شاہ قلندر وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اس باب میں خواتین صوفیوں کے ذیل میں فاطمہ بن ابوعلی دقاق اور رابعہ بصری کا ذکر ہے۔

نواں باب جو کہ شاعروں کا تذکرہ ہے چار چمن پر مشتمل ہے۔ پہلا چمن دو نہروں میں منقسم ہے۔ پہلی نہر میں عربی اور دوسری نہر میں ترکی شاعروں کا ذکر ہے۔ دوسرا چمن فارسی کے ۴۳ ابتدائی شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ تیسرا چمن عہدِ وسطیٰ کے ۱۹ شعرا کے احوال کو محیط ہے۔ چوتھا چمن پہلے چمن کی طرح دو نہر میں منقسم ہے۔ پہلا نہر ۲۸ جدید شاعروں کا احوال ہے۔ دوسرا نہر دو سفینوں پر

مشتمل ہے۔ پہلا سفینہ ان معاصر شعرا کے ذکر پر محیط ہے جو ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور دوسرا سفینہ ہندوستان کے معاصر فارسی شاعروں کا احوال ہے۔ یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ نذیر صاحب نے جس طرح 'باغستان' کے منابع اور مصادر کی فہرست مرتب کی اور صوفیا کے باب میں مذکورہ صوفیا کے نام درج کیے، اگر شاعروں کی فہرست بھی شامل ہوتی تو مقالہ سے ادبی نقطۂ نظر سے استفادہ کے امکانات چند برابر ہو جاتے۔ دوسری بات یہ کہ استاد احمد گلچین معانی اپنے مشہور تذکرہ 'کاروان ہند' میں جو کہ جہانِ فارسی سے ہندوستان مہاجرت کرنے والے شعرا کا دو جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم تذکرہ ہے، کہتے ہیں کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کاوش لچھمی نراین شفیق کا تذکرہ 'شام غریباں' ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ 'باغستان' میں اس موضوع پر ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ اس تذکرہ کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے 'باغستان' اپنی نوعیت کا واحد تذکرہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام الدین ریاضی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہے تھے لیکن اس میں محض عمومی اطلاعات پر اکتفا کیا۔ 'باغستان' کے مطالعہ سے عہدِ شاہجہاں اور اورنگ زیب سے متعلق بعض اہم ثقافتی اور تاریخی اطلاعات ملتی ہیں۔ نذیر صاحب نے اختصاراً ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم بات دارا شکوہ کے قتل سے متعلق امام الدین ریاضی کا بیان ہے۔ ریاضی نے دارا شکوہ کی دو رباعیاں بھی نقل کی ہیں۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ دو رباعیاں دارا شکوہ کے اشعار میں ملتی ہیں یا نہیں۔ جس سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ ریاضی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا شکوہ شاہ ابو المعالی سے اکثر مکاتبت کرتا تھا۔ اورنگ زیب، اس کے عہد اور بعد کے حالات سے متعلق بھی 'باغستان' ایک اہم منبع مانا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد صاحب نے بڑی دیدہ ریزی سے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اسی مقالہ میں پروفیسر نذیر احمد، مشہور چشتی بزرگ شاہ کلم اللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ اکثر محققین نے نور اللہ کو شاہ کلیم اللہ کا والد بتایا ہے لیکن پہلی بار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ شاہ کلیم اللہ کے والد کے طور پر جانے جانے والے نور اللہ دراصل احمد ہروی کے بیٹے نور اللہ معمار ہیں لیکن انہوں نے اس بات کیلئے کوئی سند پیش نہیں کی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے پہلی بار اپنے وسیع مطالعہ اور نکتہ سنجی کی بنیاد پر کلیم اللہ کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے اس

نظریہ کو مستند بنایا ہے۔ کلیم اللہ نے اپنے ایک خط میں امام الدین کو اپنا چچازاد بھائی بتایا ہے جس سے یہ بات پایۂ اثبات کو پہونچتی ہے کہ شاہ کلیم اللہ مشہور صوفی بزرگ، احمد لاہوری کے پوتے ہیں۔ نذیر احمد صاب نے اس بیان کو مزید مستند بنانے کیلیے دوسرا حوالہ آزاد بلگرامی کے تذکرے 'مآثر الکرام' کا دیا ہے جس میں وہ کلیم اللہ کے احوال کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اگر چہ شاہ کلیم کے دادا فنِ تعمیر کے ماہر تھے لیکن خدا نے ان کو قلوب انسانی کی تعمیر کی صفت سے نوازا ہے۔

پروفیسر صاحب کے مذکورہ بالا دلائل نے پہلی بار اس بیان کو سندیت بخشی کہ مشہور چشتی صوفی شاہ کلیم اللہ، احمد لاہوری، معمارِ تاج محل کے پوتے ہیں۔ 'باغستان' میں استاد احمد معمار سے متعلق زیادہ اطلاعات نہیں ہیں۔ البتہ ان کے بیٹوں سے متعلق بعض اہم اطلاعات جو نذیر صاحب نے فراہم کی ہیں ذیل میں اختصاراً پیش کی جاتی ہیں:

> استاد احمد معمار کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام عطاء اللہ رشیدی تھا۔ رشیدی ریاضی اور متعلقہ علوم میں مہارتِ کامل اور شعروشاعری سے بھی شغف رکھتے تھے اور اپنے چھوٹے بھائی لطف اللہ مہندس (ریاضی کے والد) کے استاد بھی تھے۔ ان کی تین کتابیں ملتی ہیں: بیج گنت، خلاصہ راز اور خزائن الاعداد۔ یہ تینوں کتابیں ریاضی سے متعلق ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نے ان تینوں کتابوں کو مختلف فہرستوں میں تلاش کرنے کے بعد ان کے مختلف مراجع کا بھی ذکر کیا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ رشیدی، اورنگ زیب کی بیگم ملکہ ربیع درّانی کے مزار کے معمار تھے جو کہ اورنگ آباد میں ۱۶۵۰ء میں بنایا گیا۔ 'باغستان' میں رشیدی کا ذکر تین مقامات پر آیا ہے۔

لطف اللہ مہندس (والد ریاضی)، استاد احمد معمار کے دوسرے بیٹے کے باب میں نذیر احمد صاحب نے سیّد سلیمان ندوی کی تحقیقات پر تکیہ کرتے ہوئے ان کی کتابوں کی مکمل فہرست اپنے مقالے میں درج کی ہے لیکن انہوں نے 'باغستان' کے مطالعہ سے لطف اللہ مہندس کی دو اور کتابوں، شرح تہذیب اور تذکرۂ علمائے مہندسی، کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ سیّد سلیمان ندوی نے رسالہ بیان کو کہ جو بلاغت کے موضوع پر ہے مہندس کے آثار میں شمار کیا ہے۔ لیکن نذیر احمد صاحب نے یہ بتایا ہے کہ یہ رسالہ دراصل امام الدین ریاضی کی تصنیف

ہے نہ کہ مہندس کی۔

نورالدین معمار رشیدی، استاد احمد معمار کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور فنِ معماری، ریاضی و متعلقہ علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ خوشنویس بھی تھے اور مہندس کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہفت قلم بھی تھے:

گنج ہنر آمدہ در مشتِ او ہفت
قلم راندہ سہ انگشتِ او

خود امام الدین ریاضی کے احوال و آثار سے متعلق 'باغستان' ایک اہم منبع ہے اور پروفیسر نذیر احمد نے اس کے مطالعہ سے ریاضی کے آثار کی مکمل فہرست فراہم کی ہے۔ اسی طرح ریاضی کے چھوٹے بھائی میرزا ابوالخیر معروف بہ خیر اللہ سے متعلق بھی اہم اطلاعات اس کتاب میں موجود ہیں۔ نذیر صاحب نے ان کی تالیفات کی فہرست آمادہ کی ہے اور یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ ان کے نسخے کہاں کہاں موجود ہیں۔

امام الدین ریاضی صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ اس نے ۱۷۰۴ء سے قبل اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سفینۂ خوشگو، تذکرۂ ہمیشہ بہار، صحفِ ابراہیم، مخزن الغرائب وغیرہ میں اس کی شاعرانہ شخصیت سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں۔ 'باغستان' کے مطالعہ سے نذیر احمد صاحب نے ریاضی کی بعض غزلوں کو جو کہ صائب، طالب، ظہوری وغیرہ کے جواب میں ہیں اپنے مقالہ میں درج کیا ہے جس سے ریاضی کی شاعرانہ قابلیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے استاد احمد معمار اور ان کے خاندان سے متعلق جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ یقیناً اس باب میں اہم اضافہ ہیں۔ بالخصوص 'تذکرۂ باغستان' کا انکشاف اور اس کے مطالعے کے نتیجے میں بہت سی اطلاعات پہلی مرتبہ ہم تک پہنچ سکیں اور کئی باتوں کی تصحیح ہو سکی۔ تاہم، 'تذکرۂ باغستان' جیسے متنوع مطالب کے تذکرہ میں اور بھی بہت سی اہم تاریخی اور ادبی اطلاعات موجود ہیں لیکن بہرحال چوں کہ استاد نذیر احمد کا ہدف خانوادۂ احمد معمار سے متعلق اطلاعات کی فراہمی تھا لہٰذا وہ اسی پر متمرکز رہے اور اس نابغۂ روزگار سے متعلق اطلاعات کی تحقیق کی جو بجائے خود ایک معرکہ آرا کام ہے جس سے علمی حلقہ ہمیشہ مستفید ہوتا رہے گا۔

مصادر:

- اخلاص شاجہان آبادی، کشن چند، ہمیشہ بہار، بہ تصحیح ڈاکٹر وحید قریشی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۳ء۔
- خوشگو، بندرا بن داس، سفینۂ خوشگو، بہ اہتمام سید شاہ محمد عطاء الرحمان کاکوی، سلسلۂ انتشارات ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنا، ۱۹۵۹ء۔
- ریاضی، امام الدین حسین، تذکرۂ باغستان، مخطوطہ، ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔
- شفیق اورنگ آبادی، منشی لچھمی نارائن، تذکرۂ شام غریباں، ترتیب محمد اکبرالدین صدیقی، کراچی، ۱۹۷۷ء۔
- معانی، احمد گلچین، کاروان ہند، مؤسسۂ چاپ وانتشارات آستان قدس رضوی، مشہد، دو جلد، چاپ اول ۱۳۶۹ھ ش۔
- ہاشمی سندیلوی، شیخ احمد علی خان، مخزن الغرائب، مخطوطہ ۱۱۲۰، حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ۔
- آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۸۷۳ء
- آزاد بلگرامی، میر غلام علی، مآثر الکرام، بہ تصحیح عبداللہ خان، بہ اہتمام مولوی عبدالحق، کتابخانۂ آصفیہ، حیدرآباد، ۱۹۱۳ء
- Beale, Thomas William: An Oriental Biographical Dictionary, London, 1894; Kraud Reprint Corporation, New York, 1965.
- Chaghatai, Mohammad Abdullah, Islamic Culture, April, 1937.
- Kanwar, H.I.S., Islamic Culture, Jan., 1974.
- Khatoon, Prof. Rehana, Prof. Nazir Ahmad's Essays on Indo-Islamic Art, Architechture & Traditional Medicien, Department of Persian, University of Delhi, Delhi, 2011.

Marshall, D.N.: Mughals in India (A Bibliographical Survey of Manuscripts), Mansell Publishing Limited, London and New York, 1985.

Sulaiman Nadvi, Journal of the Bihar Research Society, Vol. XXXIV, March-June, 1948.

منزرت فاطمہ

۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان وادب کے چند ہندوستانی اساتذہ کا مختصر تعارف

استادانِ گرامی، معزز سامعین اور عزیز دوستوں میرے مقالے کا عنوان ہے۔ "۱۹۴۷ کے بعد فارسی زبان وادب کے چند ہندوستانی اساتذہ کا مختصر تعارف" میں شکر گذار ہوں جناب ڈاکٹر سید رضا حیدر صاحب کی جنھوں نے نہ صرف یہ سمینار منعقد کیا بلکہ ہم جیسے طلبا کو اس میں شریک کر کے فارسی زبان وادب کے ان آعلی محققین سے متعارف کرایا ہے۔ جن میں سے بعض کے نام ہم نے صرف سنے تھے یا ان کی تصانیف سے استفادہ ہی کیا تھا۔ اس سمینار سے ہم نہ صرف ان کے علمی وادبی کارناموں بلکہ ان کی روش تحقیق وتدوین سے بھی آشنا ہوے ہیں۔

احقر نے اپنے اس مقالے میں فارسی زبان وادب کے ان نامور محققین کے احوال وآثار کا ذکر کیا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد فارسی کی گران بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں بعض استاد ایسے ہیں جن کا براہ راست تعلق محقق دوراں پروفیسر نذیر احمد صاحب سے تھا۔ اس ضمن میں سرفہرست آپ کے استاد "پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب" صاحب کے احوال وآثار کا ذکر پیش خدمت ہے۔

ا۔ استاد ادیب کی پیدایش ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ کو بہرائچ، اتر پردیش میں ہوئی۔ روایت زمانہ کے مطابق آپ کی ابتدایی تعلیم عربی وفارسی ہی تھی۔ ان کے والد اپنے دور کے نامور حکیم تھے

لہذا وہ مسعود حسن صاحب کو یونانی حکمت میں ماہر و کامل بنانا چاہتے تھے۔ کچھ حالات زمانہ اور کچھ فطری ذوق وشوق کے سبب آپ نے جدید طرز تعلیم کو اپنایا اور اس میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے استادی کے عہدے پر مأمور ہو گئے۔

اور جلد ہی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی و اردو میں لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا یہیں سے آپ کی فارسی تحقیق و تدوین کا آغاز ہوا۔ آپ نے سعادت یار خاں رنگین کی نثری کتاب ''مجالس رنگین'' جو فارسی زبان میں لکھی گئ ہے۔ اس کے قلمی نسخہ پر ایک پر مغز مقدمہ تحریر کیا جس میں اس کتاب کی اہمیت وارزش تفصیل سے بیان کی ہے اور رنگین کے حالات زندگی اور شخصیت کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فرہنگ اقبال ایک ایسی فرہنگ جس میں عربی و فارسی کی ضرب الامثال کو جو روز مرّہ کی زندگی اور ادبی زبان و بیان میں برمحل استعمال ہوں پروفیسر صاحب نے اپنے قوت حافظہ کے زور پر ردیف وار تیار کیا۔ جس وقت یہ فرہنگ تیار کی گئی اس وقت تک عربی و فارسی امثال کا اتنا ضخیم اور سائنٹفک مجموعہ دستیاب نہیں تھا۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

☆ فیض میر فارسی کا ایک مختصر رسالہ جس کو پروفیسر صاحب نے نہ صرف تصحیح کیا بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا، شروع میں ایک مفصّل مقدمہ اور پھر پانچ حکایتیں جو میر نے اپنے بیٹے کی اصلاح کے لئے لکھی تھیں۔ اس کے دو ایڈیشن پہلا ۱۹۳۹ء اور دوسرا ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ''فرہنگ فیض میر'' کے اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ جس کی وجہ سے اس رسالہ میں محاورات کا بکثرت استعمال تھا۔ اس فرہنگ کے تیار کرنے میں انہوں نے فارسی لغات و محاورات کے کمیاب قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا اور تقریباً دس فرہنگوں کے نام بھی دیے ہیں۔

☆ متفرقات غالب کا قلمی نسخہ بہ صورت بیاض پروفیسر صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔ جس میں تقریباً ۴۸ مکتوب و منظوم فارسی خط، دو فارسی قطعہ، ایک فارسی مثنوی اور ایک اردو غزل کے علاوہ کچھ مختلف لوگوں کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ مثلاً قطعہ قاسم بہ غالب، اقتباس مثنوی خلیل بہ جواب مثنوی غالب اور گل محمد خان ناطق مکرانی کا وہ خط ہے جس کا جواب ''پنج آہنگ'' میں موجود ہے۔ اس کا مقدمہ بہت وقیع ہے۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ۱۹۴۷ء میں

رامپور کے کتاب خانہ رامپور اور دوسرا ۱۹۶۹ء میں کتاب نگر لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔

☆ ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ: پروفیسر صاحب کے مطابق کسی ایرانی نے شبیہ گردانی سے متعلق نہیں لکھا تھا۔ وہ خود ایران گئے وہاں سے آٹھ کتابیں تعزیہ ناموں سے متعلق لائے جن کے کچھ اقتباسات اپنی اس تصنیف میں پیش کیے جو ۱۹۶۶ء میں الواعظ صفدر پریس لکھنؤ سے شایع ہوئی۔

☆ قواعد کلیہ بھا کا از میر خان ابن فخر الدین محمد: یہ کتاب ہندی شاعری کو سمجھنے کے لئے فارسی میں لکھی گئی۔ پروفیسر صاحب نے اس کا ایک مفصل مقدمہ تیار کیا ہے۔ جس میں تحفۃ الہند اور اس کے مصنف کا حال ہے۔ اس کتاب کے ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کو سنسکرت پراکرت اور برج بھاشا پر کافی عبور حاصل تھا۔ ہندی الفاظ پر اعراب لگا کر ترجمہ کو صحیح تلفظ کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں شایع ہوئی۔

☆ ایران میں مرثیہ نگاری: ایک تاریخی جایزہ: استاد شریف حسین قاسمی صاحب کا مقالہ اس موضوع پر سید حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامہ میں موجود ہے۔ جس میں استاد نے یہ فرمایا ہے کہ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔

۲- پروفیسر ہادی حسن (۱۸۹۴-۱۹۶۳) یہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے' آپ کے والد حیدر آباد میں کلکٹر تھے اور بعد میں کمشنر کے عہدے پر مامور ہوئے۔ والدہ ایرانی النسل تھیں۔ ابتدائی اور روایتی تعلیم کے بعد آپ فرگوسن کالج پونہ میں سائنس کے طالبعلم ہوئے یہاں سے B.Sc. کی اور اعلی تعلیم کے لئے لندن چلے گئے۔ جہاں کیمبرج کالج سے Chemistry, Botany, Geology, میں ڈگریاں حاصل کیں۔ ہندوستان آ کر آپ کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہء Botany میں ریڈر کی حیثیت سے ہوا۔ چند سال بعد دوبارہ لندن گئے اس بار فارسی زبان وادبیات میں ''ترتیب وتحشیہ دیوان فلکی'' کے عنوان سے Ph.D. کی ڈگری حاصل کی ہندوستان واپس آ کر دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے لیکن اس بار شعبہء فارسی میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور صدر شعبہ کی نشست سنبھالی۔ حسن صاحب زبردست خطیب اور اعلی پایہ کے دانشور تھے۔ ۱۹۵۹ء میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے Certificate of Honor اور ۱۹۶۱ء میں حکومت ایران نے ''نشان دانش درجہء اول'' عطا کیا۔ ۱۹۶۱ میں .U.G.C

نے Speciasl Certificate سے نوازا۔ ۱۹۵۸ء میں سبکدوش ہوئے اور ۱۹۶۳ میں علی گڑھ میں انتقال ہوا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔

فارسی زبان وادب میں آپ کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کی فہرست نہایت طویل ہے جو ملک و بیرون ملک کے مجلات میں شائع ہوئے۔ آپ کی تالیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

1. Studies in Persian Literature .1923

2. History of Persian Navigation. 1928

۳-فلکی شروانی حیات وآثار ۱۹۲۹م

۴-دیوان فلکی شروانی، چاپ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۲۹۔

۵-رضی الدین نیشابوری، حیات وآثار ۱۹۴۰۔

6.Mughal Poetry

۷-دیوان ہمایوں بادشاہ، ۱۹۵۳۔

۸-قاسم کاہی، حیات وآثار ۱۹۵۴۔

۹-دیوان قاسم کاہی۔

۱۰-مجموعہ مقالات (فارسی) حیدرآباد دکن ۱۹۵۲۔

۱۱-شکنتلا (ترجمہ فارسی) ۱۹۵۶۔

۱۲-تحقیقات ادبیات فارسی ۱۹۵۸۔

۳۔ پروفسور ضیاء احمد بدایونی: ۱۲ستمبر ۱۸۹۴ء میں مولوی رفیع احمد عالی کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور اسکولی تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی زبان وادبیات میں M.A. کیا۔ پروفیسر ضیاء احمد کو اردو و فارسی دونوں زبانوں پر یکساں کمال حاصل تھا۔ وہ بہترین محقق اور بلند پایہ نقاد تھے۔ ترجمہ پر ان کی زبردست بالا دستی تھی۔ ان کی تصنیفات اور مقالات کی طویل فہرست میں سے چند کا ذکر پیش خدمت ہے۔

کتب

۱۔ تجلیات	۷۔ قصاید مومن
۲۔ تذکار سلف	۸۔ دیوان مومن

۳۔ طعات ۹۔ قول سدید
۴۔ یادگارِ عالی ۱۰۔ مکتوبات بنام آقای ضیاء احمد بدایونی
۵۔ سمن زار ۱۱۔ مجموعہ مقالات فارسی
۶۔ مباحث مسایل ۱۲۔ جلوہ حقیقت

Persian Articles

1- Development of Persian Literature during the tme of Akbar.

2- Qasim: Irslan published in " Indo-Iranica" Calcuuta.

3- Abdullah Ansari.

4- Aazad Bilgirami.

5- A study of Sina-e-Kusrau.

اردو مقالات

۱۔ فارسی ادب پر عربی کا اثر ۱۱۔ نل ودمن کا جواب
۲۔ فارسی شعراور نعت رسولؐ ۱۲۔ نجات الرشید (البدایونی)
۳۔ فارسی شاعری اور ہجویات ۱۳۔ مومن کا فارسی کلام
۴۔ جدید فارسی شاعری کے رجحانات ۱۴۔ فارسی غزل اور غالب
۵۔ منوچہر دامغانی ۱۵۔ مولانا صہبائی
۶۔ حکیم سنائی کا مذہب ۱۶۔ غالب کا نعتیہ کلام
۷۔ خاقانی شروانی ۱۷۔ غالب
۸۔ عہدِ خاقانی کی چند جھلکیاں ۱۸۔ عمر خیام اور اس کی شاعری
۹۔ معلم اخلاق نظامی ۱۹۔ فارسی شاعری اور ہجویات
۱۰۔ فیضی اور اس کی مثنوی

۴۔ پروفیسر وحید مرزا: یکم جنوری ۱۸۹۸ میں پیدا ہوئے۔ انٹر پاس کرتے کے بعد پنجاب

یونیورسٹی میں .M.A میں داخلہ لیا اور اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دوسال تک اسکالرشپ ملا جس سے انگلستان سے Sir E.Denison Ross کی راہنمائی میں Ph.D کرنے کا موقع ملا۔ لندن سے آنے کے بعد روبارہ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ عربی میں درس وتدریس پر دوبارہ مأمور ہوئے اس کے بعد ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے گران مایہ آثار درج ذیل ہیں۔

1- Life and works of Amir Khusrau - Calcutta ,1935.

۲۔ احوال وآثار امیر خسرو (اردو) ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۴۹ء۔

۳۔ مثنوی نہ سپہر • ترتیب وتدوین، باانگریزی مقدمہ

۴۔ خزائن الفتوح (انگریزی ترجمہ، تصحیح وتحشیہ وتمہید، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ وترتیب۔

۵۔ سید حسن صاحب: ۱۹۱۱ء میں قصبہ شیخو پورہ، ضلع مونگیر، بہار میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں سایہ پدر سے محروم ہوگئے والدہ نے تعلیم وتربیت کی، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہی حاصل۔ دوسال بعد پرائمری اسکول جانے لگے اس کے بعد مڈل اسکول شیخو پورہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں مڈل کلاس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے للہ آنرز فارسی میں اول پوزیشن میں پاس کیا اور طلائی تمغہ کے حقدار ہوئے۔ اس کے بعد یہیں سے ایم۔ اے۔ اردو وفارسی میں کیا اور ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے بہار نیشنل کالج میں اردو وفارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں پٹنہ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۵۵ء میں جدید فارسی تعلیم کے لئے ایران گئے۔ ۱۹۵۷ء میں پروفیسر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۷۲ء میں ریٹائرڈ ہوگئے۔

سید حسن صاحب نے کالج کے زمانے سے ادبی وتحقیقی مقالات لکھنا شروع کردیئے تھے۔ آپ کے مقالات کا مجموعہ ''سلک کلک'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے (۱) فارسی نثر کے ساتھ ساتھ آپ کو فارسی شعر میں بھی دلچسپی تھی اور آپ سرمد تخلص کرتے تھے۔ اردو میں ہزل بھی کہتے تھے اور چرخ

تخلص کرتے تھے۔ آپ کا اہم کام نجات حسین کی ''سوانح لکھنؤ'' کا تعارف ہے۔ اررو و فارسی کی قدیم لغت ''زفان گویا'' کی معرفی کا سہرا بھی حسن صاحب کے سر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے تحقیقی و تدوینی کاوشوں میں رکن صاین ہروی کے دیوان کی تصحیح، تحشیہ اور مقدمہ تیار کیا۔ بنگلہ دیش کے ایک شاعر و ادیب سعادت اللہ رنگ پوری کے مکتوبات کو ''ترقیم السعادۃ'' کے نام سے ایک مفصل مقدمہ کے ساتھ انگریزی میں شائع کرایا۔

۶۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۹۱۱ء) کا مولد قصبہ دیسنہ، پٹنہ، بہار ہے علی گڑھ سے استاد سید سلیمان ندوی کے زیر سرپرستی ایم۔ اے۔ کیا۔ آپ کی محققانہ طبیعت سے متاثر ہو کر ۱۹۳۵ء میں سلیمان ندوی صاحب نے آپ کو دارالمصنفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ سے وابستہ کیا جہاں انہیں اپنی تحقیق اور تدوین کو اجاگر کرنے کے لئے بھرپور مواد فراہم ہوا تا حیات اس ادارے سے منسلک رہے اور فارسی و عربی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی سے کامل واقفیت تھی۔ بہترین ناقد و محقق تھے۔ آپ کی اردو اور فارسی کی تالیفات نہایت گران بہا سرمایہ ہیں جو طلبا کے لئے ہمیشہ سودمند ثابت ہوں گی۔ ۱۹۸۷ء میں ایک ناگہانی حادثے نے اس محقق عظیم کو دنیا سے رخصت کر دیا۔

تالیفات

۱۔ بزم تیموریہ
۲۔ بزم صوفیہ
۳۔ بزم مملوکیہ
۴۔ ہندوستان درنظر امیر خسرو
۵۔ نظام ارتشی در عہد وسطی ہند
۶۔ نظری بر سلاطین و علما و مشایخ ہند
۷۔ علامہ شبلی کی عالمگیر کا انگریزی ترجمہ
۸۔ عہد مغول درنظر مورخان ہندو مسلمان

English Translations

1- Heeroic deeds of Muslim women

2- Arab Naviion
3- Literary progress of the Hindu's during the Muslim rule in India.
4- Muslim Observation.

۷۔ پروفیسر امیر حسن عابدی: پروفیسر نذیر احمد صاحب کے 'یار غار' پہلی جولائی ۱۹۲۱ء میں غازی پور بنارس میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم لکھنؤ' بنارس اور آگرہ میں ہوئی آگرہ سے Ph.D. کرنے کے بعد بحیثیت استاد پہلی تقرری دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں ہوئی ۱۹۵۵ء میں فارسی زبان کی شیرینی اور لذت کو حاصل کرنے کے لئے ایران کا رخ کیا۔ جہاں آپ کی ملاقات سید حسن صاحب اور پروفیسر نذیر احمد صاحب سے ہوئی۔ آپ تینوں نے ایک ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایران سے لوٹنے کے بعد تینوں اپنے اپنے شہروں کو لوٹ گئے اور ہنوز فارسی کی خدمات زیادہ تندہی سے کرتے رہے۔ تینوں کی دوستی بدستور قایم رہی علمی وادبی محفلوں میں برابر ملاقات رہی اور رشتہ تاحیات قایم رہا۔
اسی سال استاد عابدی صاحب کا تقرر دہلی یونیورسٹی میں ریڈر کی پوسٹ پر ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ادارۂ علوم شرقی کابل یونیورسٹی میں آپ نے محقق ادبیات فارسی کی حیثیت سے شرکت کی۔ آپ ہمیشہ پا بارکاب رہتے تھے۔ کانفرنسوں' سمیناروں' جلسوں اور ادبی محافل کے علاوہ بھی آپ ہمیشہ سفر میں ہی رہتے تھے۔ یہ سفر کبھی کسی کتاب خانے کا ہوتا تھا یا کسی میوزیم کا۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی کتب خانہ یا میوزیم ایسا ہو جہاں استاد نہ گئے ہوں۔ آپ نے متعدد سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے ملاووہ ان میں مہمان اعزازی یا مہمان خصوصی کے طور پر اپنی علمی وادبی و تحقیقی گفتگو سے انہیں کامیاب بنایا ہے۔ آپ کی عالمانہ اور محققانہ نقطۂ نظر سے تحقیق وتدوین کا کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہ رہ سکا۔
آپ کی گفتگو کا انداز نہایت سادہ' سلیس' رواں اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دلچسپ اور کارآمد ہوتا تھا۔ مجھ ناچیز کو بھی بارہا آپ کی عالمانہ تقریروں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے طالب علمی کے قصے یا' مختلف اشخاص' مقامات' کتابیات وغیرہ سے متعلق خیالات اور اظہارات کو بہ نفس نفیس سننے کا بھی موقع نصیب ہوا ہے۔۔ آپ نے ادبی مواد کی جستجو میں نہ معلوم کتنے سفر کیے ہیں۔ ان اسفار سے متعلق دلچسپ اور دلآویز قصائص آپ جس انداز

سے بیان کرتے تھے سننے والے ہمہ تن گوش رہتے تھے بات مکمل کر کے خود بے ساختہ ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ راقم کو بھی دو تین مرتبہ استاد کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔ پورے سفر میں آپ نہایت مستعد اور چاق و چوبند رہتے۔ قبل از وقت اسٹیشن پہنچ جاتے اور وہاں بھی محفل آراستہ ہو جاتی سفر کتنا بھی طویل ہوتا تھکان اور بوریت کا شائبہ بھی نہ ہوتا اور وقت گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور منزل پر پہنچ جاتے۔ آپ نے تقریباً سارے ہندوستان کے مختلف مقامات کا بارہا سفر کیا تھا کچھ یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں لگاتار جاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ متعدد بار ایران، پاکستان، افغانستان، تاجیکستان، قزاقستان، ازبکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ کے سفر بھی کیے۔

آپ کی تالیفات و تراجم کی طویل فہرست ہے۔ آپ کے مقالات کے مجموعے مقالاتِ عابدی (اردو)، سیمای عابدی (فارسی) Persian Literature(English)، میں جنہیں پروفیسر سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی صاحبہ نے مرتب کیا ہے۔ ان کے علاوہ دو ضخیم جلدیں قندِ پارسی میں جس میں ہندو بیرونِ ہند کے فارسی اساتذہ و محققان نے استاد عابدی اور ان کی تخلیقات و تحقیقات سے متعلق پُر مغز مقالات تحریر کیے ہیں۔ آپ کی کتب کی فہرست طویل ہے۔ چند کا ذکر پیشِ خدمت ہے۔

تراجم

۱۔ تصحیح مثنویاتِ فانی کشمیری ۱۹۶۴ء ۱۔ وکرم واروشی

۲۔ تصحیح جوگ وششٹ ۱۹۶۸ء ۲۔ گلزارِ حال

۳۔ تصحیح سوز و گداز ۱۹۸۰ء

۴۔ تصحیح منتخب اللطایف ۱۹۷۱ء

۵۔ تصحیح داستان پدماوت ۱۹۷۲ء

۶۔ تاریخِ سلاطین صوفیہ ۱۹۷۳ء

۷۔ پنچا کیانہ ۱۹۷۳ء

۸۔ ضمیمہ تغلق نامہ خسرو

۹۔ تنظیم و ترتیب عصمت نامہ

۸۔ پروفیسر نورالحسن انصاری: ۱۹۳۷ء میں اتر پردیش کے قصبہ مئو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یعنی عربی و فارسی سے ان کے دادا مولانا محمد نعمان صاحب نے بہرہ مند کیا۔ تعلیمی منازل طے کرتے ہوئے شعبہء فارسی دانشگاہِ دہلی سے ۱۹۶۴ء میں اپنا .Ph.D کا مقالہ بہ عنوان ''ادبیات فارسی در دورۂ اورنگزیب'' مکمل کیا۔ ۱۹۵۸ء میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۷۱ء میں ایران سے ڈی۔ لٹ۔ کی ڈگری حاصل کی اور وطن آ کر دوبارہ شعبہء فارسی دہلی یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں صدر شعبہ کی حیثیت سے تا حیات زبان و ادبِ فارسی کی خدمات انجام دیں۔ آپ انجمنِ استادانِ فارسی کے بانی تھے۔ آپ نے سیکریٹری کے عہدے پر رہتے ہوئے کانفرنسیں منعقد کرائیں۔ ۱۹۸۴ء میں صدرِ جمہوریہ ہند نے انہیں فارسی علمی و ادبی خدمات کے عوض President Award سے نوازا۔ انصاری صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ سیمناروں میں شرکت ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ نہایت عرق ریزی کے ساتھ مقالات لکھتے اور پیش کرتے تھے۔ آپ نے انجمنِ استادانِ فارسی کے اشتراک سے ایک مجلّہ ''بیاض'' کے نام سے نکالا جو آج بھی اسی شان سے شایع ہوتا ہے۔ شعبہء فارسی کی سابق صدر پروفیسر نرگس جہاں (روانشاد) نے آپ کے .Ph.D مقالے ''ادبیات فارسی در دورۂ اورنگزیب'' کو تصحیح و تدوین کے بعد دوبارہ شایع کیا تھا۔ جس سے ہم اور آنے والے فارسی طلبا مستفید ہوتے رہیں گے۔ آپ نے کتابوں کی تصحیح، تنقید اور تراجم میں جو خزانہ چھوڑا ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ ۱۹۸۷ء میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

آپ کی تالیفات کی فہرست یہاں پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ ترتیب متن تحفۃ الہند — ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۷۵ء
۲۔ تاریخِ ادبیاتِ فارسی در دورۂ اورنگزیب — ۱۹۶۹ء
۳۔ تصحیح، مقدمہ مآثر محمود شاہی
۴۔ ترجمہ کتاب تاریخِ زبانِ فارسی (انگریزی) — ۱۹۷۹ء
۵۔ ترجمہ کتاب داستانہای دل انگیز ادبیاتِ فارسی — ۱۹۷۵ء۔ ۱۹۷۷ء
۶۔ ترجمہ، مقدمہ و تعلیقات بر کتاب محاصرہ گولکنڈہ — ۱۹۷۵ء
۷۔ احوال و آثار امیر خسرو دہلوی — ۱۹۷۵ء

۸۔ ترجمہ وتصحیح مقدمہ مرقع دہلی ۱۹۸۱ء

۹۔ تصحیح، مقدمہ وتعلیقات برراگ درپن ۱۹۸۱ء

ان کے علاوہ انصاری صاحب کے متعدد مقالات انگریزی، اردو اور فارسی میں ہندو بیرونِ ہند بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اب میری باری آئی جگر تھام لو: اب ان کا ذکر جن کے طفیل میں یہ باادب اور بارونق محفل آراستہ کی گئ ہے اور دو دن سے ہم ایک ایسی شخصیت کے متعلق گفتگو سن رہے ہیں جنہیں دنیائے فارسی محقق دوراں، شیخ الطایفہ، مشعلِ راہ، نابغہء روزگار، شفیق استاذ فارسی کے ستون نذیر بے نظیر اور نہ معلوم کن کن ناموں سے جانتی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد اتر پردیش کے قصبہ کولھی غریب میں جنوری 1915ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں ہائی اسکول کر کے لکھنؤ تشریف لائے اور ۱۹۳۹ء میں بی۔اے۔ میں اوّل پوزیشن کے ساتھ Gold Madel حاصل کیا۔ ۱۹۴۵ء میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کی سرپرستی میں اپنا Ph.D. کا مقالہ بہ عنوان ''احوال و آثار ظہوری ترشیزی'' کیا۔ مسعود حسن صاحب جیسے باکمال استاد کو نذیر صاحب جیسا ذہین اور ہونہار شاگرد مل گیا۔ مسعود حسن صاحب جیسے نکتہ شناس نے نذیر صاحب میں وہ تمام صلاحیتیں دیکھیں جو ایک محقق ذی شعور میں ہونا چاہیے۔ آپ کی دقت نظری، تحقیقی نقطہء نظر اور تنقیدی طبیعت میں بہت سارے کارہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے۔ آپ نے نظم ونثر دونوں پر یکساں تنقیدی اور تدوینی کام کیا جس سے نہ صرف فارسی ادب کمالِ عروج پر پہنچ گیا۔ بلکہ ایسے ایسے انکشافات ادبِ فارسی میں ہوئے کہ ادبِ فارسی روشن ومنوّر ہوگیا۔ جس میں فرہنگِ قواس اور دیوانِ حافظ کی تصحیح کے لئے فارسی دنیا آپ کی مرہونِ منت رہے گی۔

۵۶-۱۹۵۵ء میں جب آپ اپنی فارسی کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے عازمِ سفرِ ایران ہوئے تو وہاں کے ماحول، دوستوں اور ایرانی اساتذہ کی صحبت اور سرپرستی نے آپ کی تحقیق وتنقید میں خاطر خواہ اضافے سے آپ کو کندن بنا دیا۔ آپ کو فارسی سے عشق تھا۔ ہندوستان واپس آ کر آپ نے عاشقِ صادق کی طرح فارسی کی وہ خدمات انجام دیں جو اس کو دینے کا حق تھا۔ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں پروفیسر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور سالہا سال صدر شعبہ کے

عہدے پر مأمور رہنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں سبکدوش ہوئے۔ یہ سبکدوشی بظاہر کاغذات پر تھی آپ کی علمی و ادبی زندگی میں اس کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا تھا۔ آپ بدستور تحقیقی و تنقیدی کاموں میں مصروف رہے۔ ہم نے ان کو بارہا اسی غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد سمیناروں میں دیکھا تھا۔ ایک دو مرتبہ ہمارے سامنے بھی دہلی یونیورسٹی بھی تشریف لائے اور شاید شعبہ اردو میں Extention Lecture (توسیعی خطبہ) دینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے دولت کدہ پر بھی جانے کا موقع ملا جہاں آپ کے ذاتی کتاب خانے اور آپ کے علمی سرمائے کے علاوہ آپ کے اعزازات کی زیارت کا شرف بھی اس ناچیز کو حاصل ہوا۔ فارسی سے متعلق کوئی چھوٹا بڑا ایوارڈ ہندوستان اور ایران میں ایسا نہیں ہے جس کو یہ شرف حاصل نہ ہو کہ وہ پروفیسر نذیر احمد کے گھر کی زینت نہ بنا ہو۔

مجھ جیسی ادنی طالبہ کے لئے یہ باعثِ فخر ہے کہ میں نے آپ کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ آپ کی عالمانہ و محققانہ گفتگو بھی سنی ہے اور خود آپ سے مخاطب ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے حالانکہ یہ گفتگو رسمی ہی سہی لیکن میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ آپ کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تدوینی تخلیقات کی طویل فہرست ہے جن کا کل سے نہایت مفصل اور تحقیقی اعتبار سے فارسی دنیا کے مایہ ناز استادان اور محققان فارسی کے ذریعے ذکر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

☆☆☆

منابع و مأخذ:

۱۔ پروفیسر نذیر احمد: در نظر دانشمندان، مرتبہ پروفیسر ماریہ بلقیس، مطبع: اسلامک ونڈرس بیورو، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء۔

۲۔ زندگی نامہ و خدمات علمی و فرہنگی '' پروفیسر نذیر احمد '' انجمن آثار م مفاخر فرہنگی، تہران، ایران، اردی بہشت، ۱۳۸۲ش۔

۳۔ سلک مضامین، سید حسن، مطبع آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ، بہار، ۱۹۸۸ء۔

۴۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب (حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر وسیم آرا، نظامی پریس، لکھنؤ، اتر پردیش، ۱۹۹۰۔

۵۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب (حیات اور کارنامے، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۳)

۶۔ سیمای عابدی، مصنف سید امیر حسن عابدی، مرتبہ سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی، ناشر شعبہء فارسی، ۲۰۰۳ء

۷۔ شیخ الطایفہ، مرتبہ پروفیسر ریحانہ خانون، ناشر شعبہ فارسی، دانشگاہ دہلی، ۲۰۰۹۔

۸۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگزیب، نورالحسن انصاری، بہ اضافہ احوال و آثار پروفیسر نرگس جہاں، ناشر شعبہ فارسی، دانشگاہ دہلی، ۲۰۰۶ء۔

۹۔ قندِ پارسی، ویژہ نامہ استاد عابدی، مقالات استاد عابدی، مرکز تحقیقات فارسی، رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو، ۲۰۰۶۔

۱۰۔ کارنامہء نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، ناشر انڈو پرشین سوسائٹی لال کنواں، دہلی، ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ محققین و منتقدین معروف زبان و ادبیات فارسی و ادبیات فارسی در ہند قرن بیستم ہمراہ بہ تاریخ مختصر نقد و تحقیق در ادبیات فارسی، مقالہ برای فوق دکتری (ڈی۔لٹ) فارسی، دکتر آصفہ زمانی، ریڈر شعبہ فارسی، دانشگاہ لکھنؤ، اترا پرادش، ۱۹۹۳ء۔

۱۲۔ ملخص، تذکرہ ریاض الوفاق از ذوالفقار علی سرمست، مرتبین سید حسن و عطا کاکوی ۱۱۲۹ھ۔

۱۳۔ نگارشاتِ ادیب از مسعود حسن رضوی ادیب، ناشر سید اظہر مسعود رضوی، راج پرنٹنگ نظامی پریس، لکھنؤ، اتر پردیش، جون ۱۹۶۹ء۔

14- Indo-Persian Literature By S.A.H.Abidi, compiled by S B.F.Husaini, Publication:Department of Persian,University of Delhi, 2003.

☆

Mohd Asif Naim Siddiqi

Professor Nazir Ahmad on Ghalib

Professor Nazir Ahmad is one of the most industrious and illustrious Scholar in the field of Indo Persian Studies that India can proudly boast of having produced in post Independence era. His scholarship in rank is not below the stature of late Dr Mohd Moin, the most prominent Iranian scholar of Modern Iran. The sphere of Professor Nazir Ahmad's scholarship is of variegated nature and is spread over many disciplines like The Science of Editing, History, Historiography, Lexicography, Hafiz Shenasi, and Ghalib Shenasi.

On the occasion of the Seminar on Professor Nazir Ahmad under the auspices of Ghalib Institute, I have chosen for my self to discuss him as Ghalib Shenas.On Ghalib I have read his three books i.e.Naqd-e Qate-e- Burhan, Ghalib Per Chand Maqale, Ghalib per ChandTtahqeeqi Motale.

Out of several aspects which have been dealt with in the above books, I chosen Professor Ahmad have detailed discussions on Zal-e Farsi and the word Khursheed to

point out the importance of his findings in the study of the origin and history of words.

Zal (ذ)

Ghalib was not in favour of the existence of Zal(ذال) (معجمہ in Persian. He expressed this view in Qati-Burhan (قاطع) (برھان) where he says that it was the practice of the scribes of Persia to provide dot on Dal of Abjad (دال ابجد). Generation of the successive periods went into the wrong direction to drive the wrong result that Zal -e- Manquta(Zal with the diacritical mark) exists in Persian. He took the same stand in a letter addressed to Sahib-e-Alam of Marahra . (Letter written to Saheb-e Alam of Marhra on 11861, Ghalib Ke Khutut Vol 3 p1018) Ghalib says, Khawaja Nasir Uddin Tusi makes mentions of eight letters which do not form the part of Persian Alphabets and does not make mention of Dal with diacritical mark (Zal). He assertively says that there is no Persian lexicon where Zal has occurred into the corpus. Guzashtan,Guzashtan,Peziruftan they all are with ze(ز).The spelling of Kaghaz (کاغذ) is with Dal-e- Mohmala(Dal without diacritical mark) Its spelling with Zal(ذ) and using Kawaghaz(کواغذ) as its plural is Arabic adherence (تعریب) . In Persian phonetic system words emanating from the same point of voice (متحد المخرج) even from close proximity of the same point of voice (قریب المخرج) are not found. Persian phonetics does not have ط، ث، ص، ح side by side with ت، س، and ہ. Persian sound system does not have ق side by side with ? because they are both متحد المخرج and قریب المخرج . The same rule is applied to Ze(ز) and Zal(ذ) .In the presence of Ze(ز) Zal(ذ) cannot exist

Assessment of Professor Nazir Ahmad: Prior to Professor Nazir Ahmad Qazi Abdul Wadood and Dr Abdul Sattar Siddiqi have also taken up the issue and have provided evidences in favour of the existence of Zal. Professor Nazir

Ahmad felt the need to delve deeper and leave no corner for doubt after Qudrat Naqvi's detailed article in favor of Ghalib on the non existence of Zal in Persian. Nazir Sahib is of the opinion that Ghalib's inadequate knowledge of Persian lexicography and poor understanding of Farhang-e Jahangiri and Rashidi has led him astray. Inju and Abdul Rashid though create some doubt about Zal by pronouncing Azar as Adar with but have never suggested replacing Zal with Ze.

Ghalib's inadequate knowledge of Persian lexicography and poor understanding of Farhang-e Jahangiri and Rashidi led him astray. Words having Zal-e Farsi like مانیذ، موبذ،نھاذ،آباذ etc are found in the oldest extant Persian lexicon Lughat-e Furs of Asadi Tusi.(465AH). The sound existed even in Pre- Islamic Persian Languages.

Nasir Uddin Tusi has codified the phonetic system of ? and ? in the following quatrain (رباعی)

آنانکہ بپارسی سخن میرانند
در معرض دال ذال را ننشانند
ماقبل وی ار ساکن جز وای بود
دال است و گرنہ ذال معجم خوانند

(Those who read and write Persian
Do not confuse Dal with Zal
If the preceding letter is consonant except وای
The pronunciation is with Dal otherwise with Zal)

In the light of the above rule words like آورند، درد، سرد، سندان، مرد etc are to be pronounced with Dal and the words like اساذہ، شاذ، یاذ، آذر، بوذ، بیذ، داذ، دیذ، روذ are to be pronounced with Zal.Persian words do not begin with Zal but زرش is an exception.

Ghalib again is unable to grasp the science of Persian lexicography by taking کاغذ as a Persian word. It is of Turkish origin and is originally pronounced as کاغد . In Persian we have the evidence of its spelling both with د and ذ.

یک نیمہ اش از مداد و نیمی کاغذ (مسعود سعد سلمان)
زرنج مدح مرا نیست صد طبق کاغذ (عبدالواسع جبلی)

Professor Nazir Ahmad starts with rebutting Ghazi's assumption that zal is not found in any lexicon. He does so by evidences showing the contrary. He has very scholarly traced the history of zal from the earliest available lexicons like Lughat-e Furs of Asadi Tusi. Words like Maneez, Mobaz, Kahbuz, Nehaz, Abaz, Raz Najhz, and Behuza have been given entry under Zal in Lugaht-e- Furs. Sixty- three words have been listed under the entry of Zal in Saha-ul furs of Mohd bin Hindu Shah Nakhjwani, Mear-e Jamali of Shams Fakhri Isfahani has fifty six words,Zafan-e-Goya of Badar Ibrahim though does not have a separate entry of Zal but provides evidence in a statements that many pronounce Baad with Zal-e- Moajjema In Sharaf Nama of Ibrahim Qawam Farooqi a detailed discussion has been presented to provide difference between Dal and Zal. Professor Ahmad also repudiates the claim of Ghalib that Persian phonetic system does not have words emanating from the same point of voice (متحدالمخرج) by providing evidences from the list of words having even neem makhraj sounds.

To buttress the argument in favour of the existence of Zal in Persian he provide the immaculate testament of Shams-i Qais Razi 's discussion on the expletive particles(Zawaid) of Zal in Al-mujam .According to Razi Zal has three Zawaid. (a) Mozare (aorist tense) here the Zal comes at the end of the words as in Ayaz, goyaz rawaz (b) Pronounces: here Zal comes at the end and is used in present tense as in meeraviz, meeaayeez etc (c) benedictory(Harfe Doa) : here the Zal comes at the end of the words with Alif as in barsaz, bedehaz . Rhyme system of Persian poetry also does not permit the use of words

ending with Dal preceded by the letters accented with vowel to rhyme with the Arabic Dal

In his findings after deep research on the subject of Zal of Pesian he is of the opinion that Zal was in use in Persian till sixth century AH in Afghanistan, Iran, and Transoxiana. In seventh century Zal of Persian was replaced with Dal in Afghanistan. But in Iran the use was continued till 9th century. After 9th century the distinction between the two disappeared.

Comment

Ghazi's inadequate knowledge of Persian lexicography and poor understanding of Far hang-e Jahangiri and Rashidi led him astray. Words having Zal-e Farsi like مایذ، موبذ، نهاذ، آباذ etc are found in the oldest extant Persian lexicon Lughat-e Furs of Asadi Tusi.(465AH).The sound existed even in Pre-Islamic Persian Languages.

Nasir Uddin Tusi has codified the phonetic system of ? and ? in the following quatrain (رباعی)

آنانکه بپارسی سخن میرانند
در معرض دال ذال را ننشانند
ماقبل وی ار ساکن جز وای بود
دال است و گرنه ذال معجم خوانند

(Those who read and write Persian
Do not confuse Dal with Zal
If the preceding letter is consonant except وای
The pronunciation is with Dal otherwise with Zal)

In the light of the above rule words like آورند، درد، سرد، سندان، مرد etc are to be pronounced with Dal and the words like ساذہ، شاذ، یاذ، آذر، بوذ، بیذ، داذ، دیذ، روذ، are to be pronounced with Zal.Persian words do not begin with Zal but ذرخش is an exception.

Ghalib again is unable to grasp the science of Persian lexicography by taking کاغذ as a Persian word. It is of Turkish origin and is originally pronounced as کاقد . In

Persian we have the evidence of its spelling both with ?and?

یک نیمہ اش از مداد و نیمی کاغذ
(مسعود سعد سلمان)
زرنج مدح مرا نیست صد بق کاغذ
(عبدالواسع جبلی)

خور and خر

In a letter addressed to Mir Mahdi Majrooh Ghalib says that in that Old Persian (وہ پارسی قدیم) of the period of Hushang ,Jamshed and Kai Khusraw خر (marked with the sign of Zamma) stands for mighty light(نور قاھر) and according to the belief of Zoroastrians آفتاب (Sun) is next to God in greatness therefore آفتاب has been given the name of خر and Sheed (شید) has been suffixed to it. Sheed stands for brightness in other words sheed means the brightness of that mighty light. خر and شید both are the name of آفتاب. When Iranians came in close contacts with Arabs, the Arab grandees having academic privilege over Iranians added و in the spelling of خر to remove perplexity and gave prevalence to خور. I prefer to write خورشید without و but with و will not be incorrect. I will also never write Khur without و. Let me also make it clear to you that خر stands for قادر (mighty) and جم stands for قادر (The powerful) جم with the suffix شید is the name of the King of the period.

Refutation of the views

Hushang and Jamshed belong to t he mythological dynasty of Peshdadyan and Kai Khusraw belongs to the mythological period of the Kiani Dynasty.

Old Persian is the name applied to the Persian Language used in the cuneiform inscriptions of the Achaemenian dynasty (550- 330 BC). It can be localized as the language of Southwestern Persia. Ghalib is not expected to know the

history of the Pre-Islamic Iranian dynasties and Languages. The spelling and meaning of Khur given by Ghalib are incorrect. The word Khur has its root in Avestan Language and is pronounced and spelled as Xvar and Hver. The word has been retained in Pahlavi with the same pronunciation and spelling. In Sanskirit it is Savar. In all the three ancient languages the word has three letters and? is part of the spelling. Ghalib's claim thus to write the خور without و has no linguistic support and also has not found entry in any Persian lexicon.

نورقاھرایزدی (The bright Divine light) as the meaning of خور or خر given by Ghalib is not found in any Persian Dictionary. In Persian texts the word has been used for common light.

Ghalib's assertion that in Zoroastrianism Aftab is next to God therefore Aftab has been given the name of خر and شید has been suffixed to it. Ghalib is incorrect in his assertion. Notwithstanding the fact that خور and شید have also been used separately, خورشید as a single word has its origin both in Avesta and Pahlavi as HAWRAXSHAETA and KHURSHET respectively.خور and شید are synonyms and stand for light and when combined give the meaning of SUN.

The importance of the findings of professor Nazir Ahmad based on an in-depth study lies in the richness and quality which saves us from getting misled. In this perspective his disapproval of Qate-e Burhan also can not be downplayed.

Syed Akhtar Husain

Professor Nazir Ahmad: A Doyen of Persian Scholarship

India is a country which has a rich collection of Persian manuscripts. These manuscripts are our national heritage and pride and provide valuable information about the glorious past of Medieval India and are indispensible for the study of Medieval Indian History. One of the dimensions of Persian Studies in India is Persian Manuscriptology which was fully realized by late Professor Nazir Ahmad. He had, though, spent his great part of life in teaching Persian language and literature in the Department of Persian, Aligarh Muslim University but he devoted his greater part of life to editing Persian manuscripts and thus he saved many Persian documents from extinction. Professor Waris Kirmani, a pupil of Professor Nazir Ahmad, once confided in me that his teacher had advised him to edit at least two to three Persian manuscripts, if he wanted to establish himself as a Persian scholar and sheer composing Urdu and Persian poetry would never help him to secure a place in the world of Persian scholarship both within and without India. Indeed, one has to be full of admiration for Professor

Ahmad's abiding interest in editing Persian manuscripts and saving them from receding into oblivion.

During the Sultanate period Persian language and literature had already made its impact upon the vast Indian sub-continent but the Indians began to show their interest in the study of Persian language since the times of the Tughlaq and the Lodhi kings. They realized that without a good dictionary, it was not possible to learn the foreign language, hence Persian lexicography became a necessity and a tool of language learning in the Indian sub-continent. Lesanush Shoara was one of the earliest lexicons written in India during the Tughlaq period and Professor Nazir Ahmad edited it in 1994. The exact name of its compiler is hitherto not known, however, Professor Ahmad has been able to trace his pen name as ASHIQ from a poem in the manuscript and the compiler had dedicated the work to Sultan Feroz Shah Tughlaq in the late 14th Century of the Christian era.

One of the most fundamental questions arising in case of editing a particular manuscript is: why the manuscript is to be edited? And the onus of it lies upon the editor to justify the act of editing the manuscript. In case of editing the Farhang-i-Lesanush Shoara, Professor Nazir Ahmad had a valid point to make that the manuscript had only two copies in the world; One preserved in the Karachi Museum introduced by Dr. Arif Naushahi and the other preserved in Florence, introduced by Paola Orsatti. The editor having realized the importance of the Manuscript which it had gained over the centuries, took upon himself the task of editing the work. He has rightly stated that the subsequent lexicographers had used Lesanush Shoara to compile their lexicons and the Dictionary under review was a source book for a number of lexicons written or compiled

during the later period such as Sharaf Nama, Kashful Lughat, Farhang-i-Sherkhani etc. Thus, the editor laid his hand on the editing of the Lesanush Shoara.

In the preface of Lesanush Shoara, Professor Nazir Ahmad has correctly pointed out that the title of the Farhang الفضلأ بیان والشعرأ لسان appears to be a "misnomer" as the Dictionary in question does not contain poetic and literary terminologies. Therefore, it is not correct on the part of the lexicographer to name or title the work as الفضلأ بیان والشعرأ لسان.

The development of lexicography in Indo-Persian literature seems to be very slow and steady and tendency of the lexicographers was to borrow words and meanings in verbatim from one another. The same tendency is also visible in case of the writers of the Memoirs of Poets. Hence, Professor Nazir Ahmad was constrained to comment on the state of the art of lexicographers that: "Persian lexicographers are not original in their compositions. They are mostly borrower and imitator". He has substantiated the point with the help of a comparative study of Lesanush Shoara and Zufan-i-Guya:

WORDS الشعرأ لسان گویا زفان

بوقلمون ونیلوفر بوقلما نگل ونیلوفر پرستگل آفتاب

گاہ حملہ النصیر رسالۃ درو گاحکارزار حملہ النصیر رسالۃ درو آورد کارزار

Besides, the editor has also painstakingly shown variants of the words in the two manuscripts of Karachi and Florence. He has also consulted a large number of lexicons in order to show the meaning of the words of Lesanush Shoara in a number of Persian lexicons. However, Professor Nazir Ahmad by editing the Lexicon Lesanush Shoara has preserved an Indo-Persian document of the Tughlaq period for posterity and the present national seminar is befitting tribute to the scholar who has set an example of Persian scholarship for us to follow:

Lives of great men all reminds us
We can make our lives sublime
And departing leave behind us
Foot prints on the sands of time.

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں